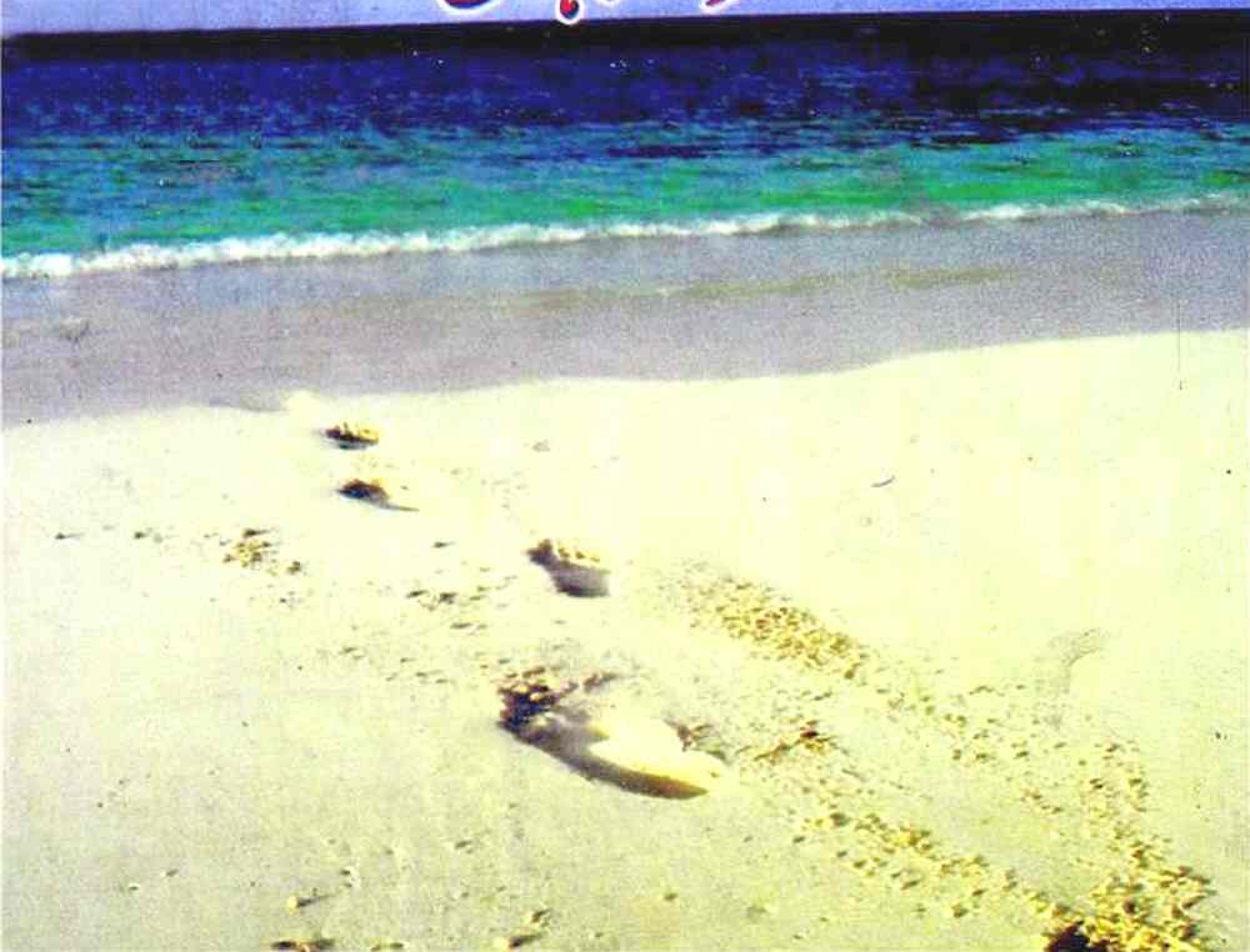
کہاں ہو تم!

(افسانے)

مسرور جہاں



کہاں ہو تم!

کہاں ہو تم!

(افسانوی مجموعہ)

مسرور جہاں

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی (لکھنؤ) حکومت اُتر پردیش
کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

KAHAN HO TUM

by

Masroor Jahan

Year of Ist Edition 2012
ISBN 978-81-8223-951-7
Price Rs. 200/-

نام کتاب	:	کہاں ہو تم!
مصنفہ و ناشر	:	مسرور جہاں
پتہ	:	195/95، کراؤن گیٹ، جگت نارائین روڈ، لکھنؤ 3 (یو، پی)
اشاعتِ اوّل	:	۲۰۱۲ء
تعداد	:	۴۰۰
قیمت	:	۲۰۰ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۶

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

ان کے نام جو مجھے اس وادئ پُرخار میں تنہا چھوڑ گئے

ابّا — جناب نصیر حُسین خیالؔ (مرحوم)

اماّں — شوکت بیگم (مرحومہ)

بھائی — تنویر حُسین عرف بابو (مرحوم)

اور

فرزند — محمد اسلم (مرحوم)

مسرور جہاں

ہم جو بچھڑیں گے تو ملنا ہے محال
نقش ڈھونڈھوگے ہمارے ریت میں

(وقار ناصری)

فہرست

☆ اپنی بات	9
☆ تجزیہ	11
☆ سچ کے سوا	25
☆ کرن پھول	31
☆ تم بھی	42
☆ کہاں ہو تم!	60
☆ عورت	66
☆ کچی دیوار	75
☆ نئے موسم کی نئی فصل	83
☆ گالی	89
☆ کہاں کا عشق !!	101
☆ آوازیں	114
☆ صلیب پر ٹنگی زندگی	119
☆ پہچان کا سفر	131
☆ میاں کی حویلی	137
☆ گوشۂ عافیت	144
☆ تماشہ نہ ہوا	154

☆ پرانے چراغ 160

☆ بڑے بھیا 167

☆ دُعا 178

☆ دو ہاتھ 185

☆ چراغوں کا سفر 191



اپنی بات

عمر کے آخری پڑاؤ پر انسان پیچھے مڑ کر ضرور دیکھتا ہے۔ یادوں کا سلسلہ ہمارا ہاتھ تھام کر ماضی کی وادیوں میں لے جاتا ہے۔ رشتوں سے جڑی کھٹی میٹھی یادیں بار بار ہمارا دامن تھام لیتی ہیں۔ عزیزوں، دوستوں اور ہاں دشمنوں سے بھی — وابستہ ہر واقعہ اور ہر حادثہ ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہ ہم نے کیا کھویا کیا پایا؟ سود و زیاں کا احساس، غم و خوشی کا حساب۔ کبھی ہمارے لبوں پر مسکراہٹیں سجا دیتا ہے اور کبھی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

آج میں بھی عمر کے ایسے ہی دور سے گزر رہی ہوں یہ شاید میرا آخری افسانوی مجموعہ ہو۔ میں اس پاک پروردگار کی بے حد و حساب احسان مند ہوں جس نے میری انگلیوں میں 'قلم' تھما کر دولتِ کونین بخش دی۔ میرا پہلا افسانوی مجموعہ شائع ہوا تو مجھے امید نہیں تھی کہ اسے خاطر خواہ پذیرائی ملے گی۔ لیکن میرے قارئین نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یکے بعد دیگرے میرے کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ اور ناول ان کے علاوہ ہیں۔

میں اپنے قارئین کی تہہ دل سے ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی ہر قدم پر میرے ساتھ رہی۔

میرے ادبی سفر کی ابتدا سے لے کر آج تک میرے چھوٹے بھائی وقار ناصری سلمہ نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ وہ میرے ایسے نقاد ہیں جنہوں نے کبھی رو رعایت سے کام نہیں لیا۔ اور میری تحریروں پر ہمیشہ سخت تنقید کی۔ مشورہ دیا اور بڑی ایمانداری سے یہ

فرض نبھایا۔ میں نے انہیں اپنا مخلص ترین دوست سمجھا اور بڑی بہن ہونے کے باوجود ان کے مشوروں کا احترام کیا۔ پاک پروردگار انہیں عمرِ دراز عطا فرمائے اور ان کے ادبی قد کو بلندی عطا کرے اور ان کے قلم کو ثبات کی دولت سے مالا مال کرے (آمین ثم آمین)

2008 میں ڈاکٹر نگہت سلطانہ عابدی صاحبہ نے میرے افسانوں پر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا ''مسرور جہاں شخصیت اور فن'' میں ان کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے یہ مقالہ تحریر کر کے میری تمام عمر کی کاوشوں کو قبولیت کی سند بخشی۔

ڈاکٹر نگہت سلطانہ عابدی صاحبہ دیانند ڈگری کالج کانپور میں شعبۂ اردو کی ہیڈ ہیں۔

تاجکستان (روس) کے جاوید صاحب میری ناولوں پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ان کا مقالہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔

—— کہاں ہو تم ''پیشِ خدمت ہے۔ ہمیشہ کی طرح قارئین کرام کی آراء کی منتظر رہوں گی۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

مسرور جہاں



تجزیہ

ڈارک براؤن بال، نیلی آنکھیں، چاندی جیسی رنگت، اور سونے کی چھک لئے سڈول جسم، شوخی اور ذہانت کی جیتی جاگتی تصویر — یہ تھی کیتھی ہاروے!!!

کیتھی میری شاگرد تھی اور اس کی عمر میری بیٹی وسندرا جتنی ہی تھی۔ شاید اسی لئے میرے دل میں اس کے متعلق کبھی کوئی بے تکا خیال نہیں آیا۔ ویسے میں اسے بہت پسند کرتا تھا۔ کیونکہ ذہانت اور خوبصورتی ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے۔ میری خاص توجہ اور شفقت نے اسے میری پسندیدگی کا احساس دلا دیا تھا۔

میرا اپارٹمنٹ میرے شاگردوں کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ کیتھی بھی ساتھی طالب علموں کے ساتھ کئی بار آ چکی تھی، لیکن اکیلی وہ کبھی نہیں آئی تھی — اس لئے ایک دن اسے اپنے اسٹیڈی روم کے دروازہ پر اکیلا اور بے وقت دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔

''سر! میں آ سکتی ہوں؟''

''ہاں، ہاں، ضرور آؤ''

میں نے اپنا قلم الگ رکھ دیا۔ اور چشمہ اتار کر رومال سے صاف کرنے لگا۔ وہ اندر آ کر کچھ جھجکی اور شرمائی تو میں نے بے تکلفی اور اپنائیت سے کہا۔

''یہاں بیٹھو میرے پاس — اور بتاؤ کیا پرابلم ہے؟''

وہ میرے برابر کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے براؤن بالوں میں انگلیاں پھنسا کر انہیں

بے ترتیب کرنے لگی۔

''سر! پرابلم یہ ہے کہ میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں''۔

اس نے شوخ لہجہ میں کہا۔

''یہ تو میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہے۔ میرے جیسے بڑی عمر کے مرد کی دوستی اگر تم کو کوئی خوشی دے سکتی ہے۔ تو میں حاضر ہوں ڈیئر''— میں نے خوش دلی سے کہا۔

''اوہ سر! مینی، مینی تھینکس''

''کیتھی! ہماری دوستی تو پکی ہوگئی۔ اب ذرا یہ بھی بتادو کہ اتنے بہت سے گورے اور کالے نوجوانوں کو چھوڑ کر تم نے مجھ بوڑھے کی طرف دوستی کا ہاتھ کیوں بڑھایا؟''۔

''کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ اس دوستی کا کبھی غلط فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ بلکہ آپ کے ساتھ رہ کر مجھے تحفظ کا احساس رہے گا''۔

''بھولی لڑکی! میرے جیسا تنہا اور رنڈوا مرد کبھی کبھی بہت خطرناک ہوجاتا ہے''۔

''آپ مجھے ڈرانے کی کوشش کررہے ہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے یہ بتادوں کہ میں فطرتاً بہت نڈر ہوں''۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ لیکن میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اور اس وقت میری بھی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی تھی۔ اس لئے میں اس کا ہاتھ تھام کر بناوٹی سنجیدگی سے بولا۔

''کیتھ! میری ایک نصیحت ہمیشہ یادرکھنا۔ مرد پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔ خواہ وہ کسی عمر، رنگ یا نسل کا ہو''۔

''سر! میں آپ کی شرارت خوب سمجھ رہی ہوں۔ خیر — جب کبھی آپ کا دل کچھ ایسا ویسا ہوگا تو میں''۔

''اس وقت تم کیا کروگی شریر لڑکی''۔

میں اس کی بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔

''میں آپ کو اچھی سی کافی پلاؤں گی — اور پھر ہم وسندرا کی باتیں کریں گے''۔

''کیتھ! کبھی کبھی وسندرا بہت یاد آتی ہے۔ اور اس کے شوہر پر بڑا غصہ آتا ہے''۔

''کیوں؟ کیوں؟''۔وہ بچوں جیسے اشتیاق سے بولی۔

''دیکھونا، کیسا ظالم ہے یہ دامودرن— میری بیٹی کو بھگا لے گیا— پاجی — خبیث''۔

''نالائق—بدمعاش—اور—ہینڈسم''۔

''ہینڈسم!؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو—؟ یہ تو تم اس کی تعریف کر رہی ہو''۔

''ہاں— آپ سے زیادہ ہینڈسم اور ڈیشنگ ہوگا دامو— جب ہی تو وسو آپ کو بھول گئی۔اور آپ اس سے جیلس ہو رہے ہیں۔ مائی پور فرینڈ''۔

''سب لڑکیاں ایک نمبر کی بے مروّت ہوتی ہیں''

''اُف اوہ! ابھی تو آپ لڑکوں کو گالیاں دے رہے تھے— اور اب لڑکیوں کو باتیں سنا رہے ہیں؟''۔

''ہاں اس لیے کہ تم بھی لڑکی ہو۔ اور مجھے یہ سوچ کر ابھی سے غصہ آرہا ہے کہ ایک روز تم بھی کسی ولیم، ٹامس یا الگزینڈر کے ساتھ چلی جاؤ گی''۔

''اوہ نو! بالکل نہیں سر! میں کہیں نہیں جاؤں گی— آپ کو چھوڑ کر''۔

''کیوں بھئی— جوان ہو، خوبصورت ہو۔ پچاسوں لڑکے تمہارے خواستگار ہوں گے''۔

''سر! کیا ایسے فضول لڑکے اس قابل ہیں کہ ان کی خاطر میں اپنے اتنے اچھے دوست کو چھوڑ دوں؟''

''پھر کیا آسمان سے ٹپکے گا لڑکا؟''۔

''اب آسمان سے ٹپکے یا زمین سے اُگے یہ میں نہیں جانتی۔ لیکن اسے بہت ڈیشنگ اور اسمارٹ ہونا چاہئے۔ بالکل آپ کی طرح''۔

''یہ بات ہے! تو پھر فوراً اچھی سی کافی پلاؤ''۔

''ابھی لائی''۔

وہ جھٹ کچن میں چلی گئی اور چند منٹ میں کافی بنا کر لے آئی۔ اس سے پہلے بھی

اس نے اپنی دوستوں کے ساتھ مل کر ہم سب کے لئے کافی بنائی تھی۔ ویسے بھی میں بے جا تکلف کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے میرے شاگرد بے تکلفی سے سارے گھر میں گھومتے پھرتے ہیں۔

میں نے کافی کا چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ پھر تعریف کے انداز میں سر ہلا کر خوش مزاجی سے کہا۔

''واقعی — تم بہت اچھی دوست ثابت ہو گی۔ کم از کم کافی کی حد تک''۔

''اوہ سر! آپ مجھے بنا رہے ہیں''۔

''یہ سَر، سَر کیا لگا رکھا ہے۔ سیدھے سادے طریقے سے میرا نام لو۔ یوں بھی کسی کے مُنہ سے اپنا نام سُننے عرصہ بیت گیا ہے''۔

''میں آپ کو فرینڈ کہوں گی۔ نام نہیں لوں گی''۔

اس نے بڑے لاڈ سے کہا۔

''چلو منظور ہے'' — اور وہ میری بچکانہ باتوں پر ہنس پڑی۔ زندگی سے بھرپور ہنسی۔ ہم اس روز دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس نے بتایا کہ وہ لندن کے مضافات میں رہتی ہے۔ جہاں اس کا چھوٹا سا کاٹج ہے۔ اور وہ اپنی چھوٹی سی آسٹن چلا کر روزانہ شہر آتی ہے۔ دن میں چار گھنٹہ ایک شاپنگ سینٹر میں کام کرتی ہے۔ اور شام کو کلاسز اٹینڈ کرتی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اس دنیا میں بالکل تنہا ہے۔ ایک نیک دل لاولد جوڑے نے اسے مشن سے لے کر پالا تھا۔ وہ بھی غریب تھے۔ اس لئے جب وہ مرے تو اس کاٹج اور آسٹن — اور بینک میں اس کے نام چند سو پونڈ کی حقیر رقم کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب وہ بزنس مینجمنٹ کا کورس کر رہی ہے تا کہ کوئی اچھی سی سروس کر سکے۔

لندن میں ہندوستانی اور پاکستانی کافی تعداد میں رہتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی الگ الگ کالونیاں بنا کر خود کو مذہب، زبان، ملک اور صوبوں میں بانٹ رکھا ہے ایک غیر ملک میں رہ کر تفریق اور تقسیم کا جذبہ مجھے بہت بُرا لگتا ہے اس لئے میں ان سے خاصا بیزار رہتا تھا۔ اور سب سے الگ تھلگ اپنے اپارٹمنٹ میں سکون سے بیٹھ کر لکھتا پڑھتا تھا۔

ایسے میں معصوم کیتھی کی دوستی مجھے بھی نعمت معلوم ہوئی۔ میں نے اسے اپنے وطن اور گھر کے بارے میں بتایا۔ جنوب کی خوبصورتی کا ذکر کیا— کھجوراہو، ایلورا، اجنتا اور تاج کی تعریفیں کیں— ناریل اور سپاری کے باغوں کے متعلق بتایا۔ پھر اسے ہندوستان کی سیر کی دعوت دے ڈالی۔ اپنی مرحوم بیوی کا ذکر کرتے ہوئے میری آواز بوجھل ہوگئی۔ وَسو کے بچپن کی شرارتوں کے قصے سنائے۔ کیتھ میرے ساتھ اداس ہوئی— اور میرے ساتھ خوش ہوئی۔

''وسندرا اپنے گھر میں دامو کے ساتھ بہت خوش ہے اب تو اس کا ایک پیارا پیارا بیٹا بھی ہے۔

میں نے بتایا۔

''تعجب ہے کہ نانا بننے کے بعد بھی آپ اتنے جوان اور زندہ دل ہیں'' کیتھی نے شرارت سے کہا— اور میں ہنس دیا۔

''کیا دامو اور وسو بھی نائجیریا میں بیٹھ کر اپنے وطن گھر— اور گھر والوں کو اس طرح یاد کرتے ہوں گے''۔

''ہاں— کیوں نہیں— انسان جہاں بھی رہے— اپنے وطن اور گھر کو کبھی نہیں بھولتا۔

''مجھے پتہ نہیں کہ اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا مبالغہ ہے''

''کیا تم ان جذبات سے عاری ہو؟ یہی کہنا چاہتی ہو نا''؟

''فرینڈ! ایک گھر کے بغیر وطن کا تصور ادھورا رہتا ہے، میری جیسی لڑکی، جس کے ماں باپ کا پتہ نہ ہو— وطن کی محبت کا دعویٰ کیسے کر سکتی ہے۔ میرا وجود تو اس خودرو پودے کی طرح ہے جو ذرا سی نمی پا کر اُگ آتا ہے۔ مشن والوں نے ازراہِ کرم پالا پوسا، اولاد کے ترسے ہوئے ایک مرد اور عورت نے پرورش کی۔ جو آپس میں شوہر اور بیوی کا رشتہ رکھنے کے باوجود میرے کچھ نہیں تھے۔ اینٹ اور گارے سے بنے گھر کو کیا میں اپنا گھر کہہ سکتی ہوں؟— ماں باپ اور بھائی بہن کے بغیر کہیں گھر بنتے ہیں؟۔ اور گھر کے بغیر وطن کا تصور بھی بے معنی سا لگتا ہے''۔

''تم اس طرح بھی سوچ لیتی ہو ننھی کیتھ؟''۔

''یہی سوچ تو ہے جس نے مجھے اپنے ہم وطنوں کے بجائے تم سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ میں نے مشن جا کر معلوم کیا تھا — وہ بتاتے ہیں کہ میری ماں انگریز تھی — اور باپ — اگر اسے باپ کہنا مناسب ہے — ایشیائی تھا — جو لندن پیسہ کمانے کے ئے آیا تھا — اور میری ماں کو ایک ناجائز بچہ کا تحفہ دے کر واپس چلا گیا'' —

''لیکن تمہارا رنگ روپ، آنکھیں اور بال تو تمہیں خالص انگریز ثابت کرتے ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ تم کو قبول نہ کریں۔ میرے خیال میں تو وہ محض اس لئے تمہیں ٹھکرانے کی حماقت نہیں کریں گے کہ ایک ایشیائی نے تمہارے خون میں اپنے رنگ اور نسل کا کھوٹ شامل کر دیا ہے۔

'' — یہ اوباش قسم کے لڑکے نائیٹ کلب، تھیٹر اور پب سے لے کر یونیورسٹی تک لڑکیوں کا بس ایک ہی مصرف سمجھتے ہیں۔ انجام کار مشن اور یتیم خانہ کے بچوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور گھر خالی پڑے رہتے ہیں''

اس نے اداس لہجہ میں کہا۔

''کیتھ ڈارلنگ تم اندر سے اتنی دکھی ہو — ایسی حساس اور شکستہ دل ہو۔ تمہارے یہ قہقہے، یہ ہنسنا مسکرانا سب ایک ڈھونگ ہے۔ تم ہمیں اور خود کو فریب دیتی ہو۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا اور کیتھ سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

اتفاق سے کیتھ کئی روز تک نظر نہیں آئی تو مجھے فکر ہوئی۔ مجھے اس کے گھر کا پتہ بھی نہیں معلوم تھا اور فون اس کے ہاں تھا ہی نہیں یہ بات وہ مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی۔ لہٰذا میں چپ چاپ اس کا انتظار کرتا رہا۔ ایک شام کو میں یونیورسٹی جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دراصل میرا ایک ضروری لکچر تھا۔ جس کی تیاری میں کئی دن سے کر رہا تھا۔ اور اب میں وہ سب کچھ اُگل دینے کے لئے بے قرار تھا۔ اچانک کال بیل گنگنا اٹھی۔ میں نے جھنجھلا کر دروازہ کھولا۔ سامنے کیتھ کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میں کھِل اُٹھا۔ ''ہیلو ڈارلنگ''! میں نے خوشی سے بے قابو ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مسکرا دی۔ دراصل میں اس کا عادی ہو گیا تھا۔ جیسے دسُو کی شادی

سے پہلے پوری طرح اس پر منحصر تھا ویسے ہی اب کافی حد تک میں نے خود کو اس لڑکی کے حوالہ کر رکھا تھا۔ یا اس نے خود ہی میری بہت سی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔

''کہاں رہیں اتنے دن تک؟''— میں نے شکوہ کیا۔

''ذرا بیمار ہو گئی تھی''—

''ذرا نہیں۔ تم بہت بیمار رہی ہو— دیکھو تو کیسی پیلی اور لاغر ہو رہی ہو— نالائق مجھے اپنی بیماری کی خبر بھی نہیں دی—؟''

''سوری فرینڈ!'' وہ ہنس دی۔ ''میں نے سوچا تھا کہ دو ایک دن میں ٹھیک ہو جاؤں گی''۔

''اچھا تم یہاں آرام سے بیٹھو— میں تمہارے لئے گرم گرم کافی لاتا ہوں''۔

میں نے اسے شانوں سے تھام کر آہستہ سے صوفہ پر بٹھا دیا— اور کچن میں جا کر کافی تیار کرنے لگا کچھ بسکٹ پلیٹ میں رکھے اور کافی کی ٹرے لے کر کیتھی کے قریب گیا تو وہ آنکھیں بند کئے نیم دراز تھی۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ چونک پڑی۔

''کیتھ— اٹھو شاباش۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے پچھلے دنوں بہت فاقے کئے ہیں۔ اب ڈٹ کر کھاؤ پیو تو ذرا طاقت واپس آئے''۔

کیتھی نے تشکر آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ذرا شوخی سے کہا۔

''تھینک یو فرینڈ— کیسا اچھا لگ رہا ہے تم سے اپنی خاطریں کراتے ہوئے''۔

''گھبراؤ نہیں— میں جلد ہی بیمار پڑنے والا ہوں۔ پھر جی بھر کے تم سے خاطریں کراؤں گا— اور ساری کسر نکال لوں گا''۔

''اوہ نو— پلیز ایسا نہ کہو''۔

''پگلی!'' میں نے اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی جلدی جلدی اپنی کافی ختم کی اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ''کیتھ! اب تم آرام کرو— جی چاہے تو میوزک سننا۔ تمہارے لئے کچھ میگزین لایا تھا۔ وہ سائیڈ ٹیبل پر پڑے ہیں۔ میں جلد ہی واپس آؤں گا۔ اور تمہارے لئے اچھا سا ڈنر تیار کروں گا۔ اور ہاں— آج رات تم یہیں رہو گی۔ واپسی کی نہ

سوچنا۔۔ گڈ بائی''۔

کیتھ نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔۔۔ اور میں دروازہ بند کر کے اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ ''بونی ایم کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ کیتھ نے کیسٹ پلیئر آن کر دیا تھا۔ میں کار اسٹارٹ کر کے اطمینان سے یونیورسٹی روانہ ہو گیا۔

یونیورسٹی سے واپس آیا تو کیتھ میرے بستر پر کمبل میں دُبکی سو رہی تھی۔ میں نے چکن سُوپ تیار کیا پنیر کے سینڈوچز بنائے۔ فرج سے پڈنگ نکالی۔ پھر کیتھی کو جگایا۔۔۔ گہری اور پُر سکون نیند نے اس کے اعصاب پر خوش گوار اثر ڈالا تھا۔ اور وہ ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ سُوپ کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے ہوئے اس نے بڑی متانت سے کہا۔

''کتنا اچھا ہوتا جو میری عمر کا تمہارا ایک بیٹا بھی ہوتا۔ بالکل تمہارے جیسا پُر خلوص اور محبت کرنے والا۔۔۔''

یہ کہہ کر وہ شرارت سے ہنس دی۔

''ہاؤ سیڈ مائی پُور گرل''۔۔۔ میں نے اونچا سا قہقہہ لگایا تو وہ بھی میرے ساتھ ہنسنے لگی۔ کھانے کے بعد ہم دونوں میوزک سنتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ رات زیادہ ہو گئی تو میں نے اپنا سلیپنگ سوٹ اسے پہننے کے لئے دیا۔ اچھے بچوں کی طرح لباس تبدیل کر کے بستر پر لیٹ رہی اور سینے تک کمبل کھینچ لیا۔ میں کشن اور کمبل لے کر صوفہ پر لیٹ رہا۔

کیتھی کا یہاں ہونا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے وسندرا کی کمی کسی حد تک پوری کر دی تھی۔ میری تنہائیوں میں مُخل ہوئے بغیر وہ میری چھوٹی بڑی ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔ کبھی کبھی جب اسے زیادہ رات ہو جاتی تو میں اسے واپس نہ جانے دیتا۔ ان دنوں یہاں سیاہ فام شورش اور دنگے پر آمادہ رہتے تھے۔ اور لوٹ مار کے واقعات تو روز مرّہ کی بات ہو گئی تھی۔ گورے بھی گھات لگا کر انہیں بے رحمی سے قتل کر دیتے تھے۔ پکڑ دھکڑ اور سزا کے باوجود آئے دن کوئی نہ کوئی واقعہ ہو جاتا تھا۔ ایک انسان کی حیثیت سے مجھے سیاہ فاموں سے ہمدردی تھی۔ اور میں ان کا استحصال کرنے والے ممالک کے سخت خلاف تھا۔۔۔ لیکن سیاہ فاموں کا رویّہ بھی مجھے پسند نہیں تھا۔۔۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ ابھی تک روشن خیال

نہیں ہوئے تھے— شاید صدیوں تک ظلم سہتے سہتے وہ باغی اور انتقام پسند ہو گئے تھے۔ اور جب کسی قوم کا مزاج ہی یہی بن جائے تو اس کی اصلاح کے لئے بھی کافی وقت اور صبر و برداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے انسان کو زمین سے اٹھا کر خلا میں پہنچا دیا تھا۔ اس لئے اس دور میں صبر و برداشت کی باتیں بے حد احمقانہ معلوم ہوتی تھیں۔

جب کبھی لندن یا اس کے آس پاس کے مضافات میں گوروں اور کالوں کے بیچ ٹکراؤ ہوتا تو ہفتوں اس کا اثر رہتا۔ اس خون خرابے سے ہمارا متاثر ہونا بھی فطری تھا— میں تو خیر قطعی غیر جانبدار تھا۔ اس لئے میری رائے محفوظ رہتی تھی— لیکن کیتھ کو اپنے مُلک میں رہ کر گوروں کی طرفداری کرنے کا پورا حق تھا۔ اس کے باوجود وہ نہ جانے کیوں ہمیشہ کالوں کی حمایت کرتی تھی۔ اور میرے ذہن میں اکثر یہ سوال اٹھتا تھا کہ کیتھ کا نرم رویّہ کہیں اس کے ایشیائی خون کے باعث تو نہیں ہے؟— میں نے کبھی مذاق اور کبھی سنجیدگی سے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی، لیکن میرے ہاتھ کچھ بھی نہ لگا۔ سوائے اس کے کہ وہ فطرتاً رحم دل تھی— اور سیاہ فاموں پر صدیوں سے ہو رہے ظلم و زیادتی کو سخت ناپسند کرتی تھی— اس نے کئی بار اسپتالوں میں جا کر سیاہ فاموں کو تحفے دیئے تھے۔ اور اپنی نیک خواہشات پیش کی تھیں۔

ایک روز کیتھ میرے پاس آئی تو بہت اداس تھی مجھے اس کی اداسی کا سبب معلوم تھا۔ چند روز پہلے گوروں اور کالوں کے درمیان خوں ریز تصادم ہوا تھا۔ ایک سیاہ فام نوجوان نے جو نشے میں دُھت تھا۔ سرِ عام ایک گوری میم کا زبردستی بوسہ لے لیا تھا— اس بات کو لے کر گوروں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا— ایک مشتعل گروہ نے سیاہ فاموں کے مکانوں میں آگ لگا دی تھی اور سب کو بری طرح مارا پیٹا۔ عورتوں اور بچوں تک کو نہیں بخشا— پھر پولیس آئی اور سیاہ فاموں کو گرفتار کر کے لے گئی۔ یہاں تک کہ زخمیوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ اس ساری ہنگامہ آرائی کا الزام سیاہ فاموں کے سر آیا۔ حق اور انصاف کے علم برداروں کی اس کھُلی دھاندلی پر دنیا بھر کے اَمن پسند چیخ اٹھے۔ پھر کیتھ کیوں نہ متاثر ہوتی۔

”کیتھ ڈارلنگ! شہر کی فضا بہت خراب ہے ایسے میں تم کو بہت احتیاط سے کام

لینا چاہیے۔ خیر اب آ ہی گئی ہو تو چند روز میرے پاس رہو"۔

"فرینڈ! کافی عرصے سے میں ان سیاہ فاموں کا نفسیاتی تجزیہ کر رہی ہوں۔ ہسپتال میں کئی کالے میرے دوست بن گئے ہیں" یقین مانو، وہ سب بے حد مخلص نوجوان ہیں۔ بس ذرا جذباتی ضرور ہیں۔ اگر ہم ان کے ساتھ برابری کا سلوک کریں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ بھی ہماری اور سب کی طرح نرم مزاج شائستہ اور مہذب نہ ثابت ہوں"۔

"تم نے بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے ڈارلنگ۔ جو کام جبر اور زبردستی سے نہیں ہو سکتا۔ وہ پیار اور خلوص سے ہو سکتا ہے"۔

"میں تم کو ہیزل سے ملواؤں گی۔ وہ بہت اچھا ہے تم اسے ضرور پسند کرو گے"۔

"بھلا میں کیوں اسے پسند کروں گا؟"۔

"کیوں کہ میں اسے پسند کرتی ہوں"۔

"صرف پسند ہی کرتی ہو—یا—اور بھی کوئی چکّر ہے؟"

اس کا موڈ خوش گوار ہوا تو میں بھی مذاق کرنے لگا۔

"میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے" اس نے شرما کر اعتراف کیا۔

"اوہ!" میں اس کی بات سن کر حیرت سے گنگ رہ گیا۔ رنگ، نسل اور قومیت کے زبردست تضاد نے گوروں اور کالوں کے درمیان جو خلیج پیدا کر دی تھی اسے پاٹنا کیتھ اور ہیزل کے بس کی بات نہیں تھی۔ صرف دو دلوں کے بیچ محبت کا رشتہ استوار ہونے سے قوموں کا مزاج اور رویہ نہیں بدل سکتا۔ اگر کیتھ اور ہیزل ایسا سوچتے ہیں تو غلط ہے۔ لیکن جذباتیت کے ایسے دوروں میں نصیحت کی خوراک اُلٹا اثر کرتی ہے۔ اس لئے میں نے کیتھ کی مخالفت نہیں کی اور خوش دلی سے اسے مبارکباد دی۔

"اُونہوں——ابھی نہیں۔ ہماری شادی کرسمس پر ہوگی۔ اس وقت تک ہیزل بھی صحت یاب ہو جائے گا"۔

"کیتھ! تم کہتی تھیں تا کہ تمہارا ہم عمر میرا کوئی بیٹا نہیں ہے سو اب میں ہیزل کو اپنا

بیٹا بنا لوں گا"۔

"سچ؟ وہ مارے خوشی کے میری گردن میں جھول گئی۔

"آئی لو یو سو مچ مائی فرینڈ"۔

جذبات کی شدت سے کیتھ رونے لگی اور میں نے بڑی مشکل سے اسے بہلایا۔

اچانک وسندرا کا خط آیا تو میں نے نائیجیریا جانے کا فیصلہ کرلیا — ان کے بیٹے کی پانچویں سالگرہ پر ان کی خوشیوں میں شامل ہونے کے لئے میرا دل تڑپ اٹھا — کیتھی نے خوشی خوشی مجھے ساری شاپنگ کرائی۔ اس نے خود بھی وسندرا، داموا ور ان کے بیٹے کے لئے خوبصورت تحفے خریدے — اس کا یہ پُرخلوص جذبہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ پوری طرح میرے خاندان میں شامل ہے۔

میرے سامان کی پیکنگ سے لے کر مجھے ایر پورٹ پہنچانے تک کی ساری ذمہ داری ازخود اس نے سنبھال لی تھی — اور اب وہ مجھ سے رخصت ہو رہی تھی تو اس کی نیلی آنکھیں نَم تھیں اور گلابی لبوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ میں نے اسے لپٹا کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"کیتھ — مائی ڈیئر! اداس نہ ہو میں جلد ہی واپس آؤں گا — اپنی اور تمہاری طرف سے وسُو اور دامو کو بھی مدعو کروں گا کہ کرسمس پر وہ تمہاری شادی میں شرکت کریں"۔

"کیا وسُو آئے گی؟"۔

"ہاں کیوں نہیں — آخر اس کی رقیب ——— لیکن پیاری سی بہن کی شادی جو ہوگی"۔

"وسُو، داموا ور ننھے کو میرا بہت بہت پیار دینا"۔

"ضرور — اب تم واپس جاؤ، فاصلہ زیادہ ہے اور لندن کی فضا ابھی خاصی گرم ہے"۔

کیتھ نے میرے گال کا بوسہ لیا — اور ڈبڈبائی آنکھوں میں پیار بھر کر روہانسی آواز میں بولی۔

"میں تمہیں بہت مِس کروں گی"۔

"——— اور میں بھی"۔

میں نے اپنے اپارٹمنٹ کی ایک چابی کیتھ کو دے دی۔ ''تم ہمیشہ کی طرح گھر آتی رہنا — وہاں کی ہر چیز تمہاری ہے — اچھا ہو گا کہ اتنے عرصہ تم وہیں رہو — اس طرح تم ہیزل کی دیکھ بھال بھی آسانی سے کرسکو گی۔ ہیزل کو میری نیک خواہشات دینا''۔

''میری خواہش تھی کہ تم ایک بار اس سے مل لیتے''۔

''کوئی بات نہیں — واپس آ کر اس سے بار، بار ملیں گے — اپنا خیال رکھنا — گڈ بائی''۔

کیتھ رخصت ہو گئی تو اچانک مجھے اداسیوں نے اپنے حصار میں لے لیا۔ کیتھ مجھے کتنی عزیز تھی۔ یہ مجھے اب محسوس ہو رہا تھا۔

اپنے بچوں سے ایک طویل عرصہ کے بعد مل کر میں بہت خوش ہوا۔ نواسہ تو میرے گلے کا ہار بن کر رہ گیا۔ وسُو اور رامو بھی میرا بہت خیال رکھتے تھے پھر بھی کیتھی کا خیال مجھے بار بار آتا تھا۔ میں نے اپنے پتہ پر اسے دو خط لکھے۔ جو —— جواب طلب نہیں تھے۔ یوں بھی اب تو میں جلد ہی اس کے پاس پہنچنے والا تھا۔

وَسُو اور رامو نے بھی کرسمس پر لندن آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

میں لندن واپس آیا تو اپنے اپارٹمنٹ کو اجاڑ اور بے ترتیب پا کر بہت جھنجھلایا — یقیناً کیتھ نے میرے جانے کے بعد۔ یہاں قدم نہیں رکھا تھا۔ اور تو اور میرے لیٹر بکس میں اس کے نام میرے دونوں خط بھی دوسرے خطوط کے ساتھ جیوں کے توں موجود تھے۔ میرے جاتے ہی کیتھ مجھ سے ایسی لاپرواہ ہو جائے گی اس کا تو مجھے گمان تک نہیں تھا۔ یقیناً اس نے سارا وقت اس کالے کلوٹے ہیزل کی ناز برداری میں گزارا ہو گا۔ مجھے ہیزل سے حسد ہونے لگا۔ اور میں دل میں بہت پچھتایا کہ ناحق ہیزل کے سلسلے میں اس کے حوصلہ افزائی کی — مجھے کیتھ جیسی پیاری دوست اپنے ہاتھ سے جاتی دکھائی دی تو میں بے چین ہو گیا۔

کئی گھنٹے گھر کی صفائی کرنے کے بعد میں بے حد تھکن محسوس کر رہا تھا۔ زور کی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ لیکن میں نے بلیک کافی اور چند بسکٹوں پر ہی اکتفا کی اور ڈاک کا مطالعہ کرنے لگا۔

اچانک کال بیل بجی ـــــ یقیناً کیتھ ہو گی یہ سوچ کر میں نے اپنا چہرہ سخت کر لیا۔ آخر میں اس سے ناراض جو تھا۔ دروازہ کھولا تو میرے سامنے کیتھ کے بجائے ایک سیاہ فام نوجوان کھڑا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، ذہین چمکیلی آنکھیں۔ گداز ہونٹوں پر افسردہ مسکراہٹ۔

''ہیلو پروفیسر ناگ راجن ـــــ میں ہیزل ہوں''۔

''اوہ ـــــ اندر آؤ۔'' میں اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔ اور یہ بھی بھول گیا کہ ابھی ذرا دیر پہلے میں اس سے کتنا حسد کر رہا تھا ـــ اب تو وہ مجھے بے حد اپنا اپنا سا لگ رہا تھا ـــ آخر وہ کیتھ کا منگیتر ہی نہیں میرا بیٹا بھی تو تھا ـــ میں نے اوپر سے نیچے تک اس کا بھرپور جائزہ لیا۔ اور مسکرا دیا ـــ وہ مجھے پسند آیا تھا۔

''ہیزل! تم اکیلے آئے ہو کیتھ کہاں ہے؟''۔

''سر ـــــ وہ ـــ وہ'' ہیزل کی آواز لڑکھڑا گئی۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ سوچا کہیں کیتھ نے اسے چھوڑ تو نہیں دیا ـــ اور اب ہیزل میرے پاس اس کی بے وفائی اور اپنی بدنصیبی کی داستان سنانے آیا ہے۔ اگر ایسا ہے۔ تو یقیناً کیتھ نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے ہیزل سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

'کیا بات ہے ینگ مین! تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو''۔

ہیزل نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ بس میرے اپارٹمنٹ کی چابی خاموشی سے میز پر رکھ دی۔

''یہ ـــــ یہ تمہارے پاس کیسے آ گئی ـــ یہ تو میں نے کیتھ کو دی تھی''۔

''سر! کیتھ نے کہا تھا کہ یہ میں آپ کو دے دوں''۔

''کیا وہ خود نہیں آ سکتی تھی؟''۔

مجھے کیتھ کی سرد مہری پر سخت غصہ آیا۔

''اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گی سَر''۔

''میری طرف سے وہ جہنم میں جائے''۔

میں چیخ پڑا — میرے دل کو اس وقت سخت ٹھیس پہنچی تھی — ہیزل میرے غصے اور دکھ سے بے خبر کھوئے کھوئے لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

''جب وہ آپ کو ایرپورٹ چھوڑ کر واپس آ رہی تھی تو ایک سنسان مقام پر چند نوجوانوں نے اس کی کار روک لی۔ اسے 'ریپ' کیا اور نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس حادثہ کے بارے میں اس نے پولیس کو کوئی بیان نہیں دیا۔ لیکن اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ چاروں سیاہ فام وہی تھے —— جن سے وہ ہسپتال جا کر ملتی رہی تھی۔ اور ان میں اپنا خلوص اور پیار بانٹتی رہی تھی''۔

ہیزل کی آواز ٹوٹ گئی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''کیا یہ حادثہ ہی اس کی موت کا سبب بن گیا؟''۔

''کسی حد تک —— کیونکہ اس نے ہسپتال میں علاج کے دوران نیند کی گولیاں کافی تعداد میں کھالی تھیں''۔

''—— تو یہ کیتھ کی نہیں —— اس کے تجزیہ کی موت تھی ——''

میرے خون ہوتے ہوئے دل نے کہا۔



سچ کے سِوا

''میں پونم ملہوترا ـــــ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ جو کچھ کہوں گی سچ کہوں گی اور سچ کے سِوا کچھ نہ کہوں گی۔''

اس سچ کی کہانی چند لفظوں میں مکمّل ہو جاتی ہے کہ یہ قتل میں نے کیا ہے۔''

ـــــ لیکن جرم کا اعتراف کرنے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ میں مجرم ہوں، گنہگار ہوں۔ کبھی کبھی ہم ان باتوں کا الزام بھی اپنے سر لے لیتے ہیں جو دراصل ہم نے کی ہی نہیں ہیں ـــــ اور لوگ اصل مجرم کو پہچاننے میں دھوکہ کھا جاتے ہیں کہ سامنے کی چیز دیکھنے کی انہیں عادت ہوتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو بچپن کی جھنڈولے بالوں والی بھولی بھالی معصوم بچّی کالج کی ذہین اور خوبصورت اسٹوڈینٹ پونم ـــــ آج پونم ملہوترا بن کر مجرموں کے کٹہرے میں نہ کھڑی ہوتی۔ اور آپ اس کی فردِ جرم نہ سنا رہے ہتے۔ یہ فردِ جرم دراصل ایک آئینہ ہے۔ جس میں سماج کے ہر اس مرد کو اپنی صورت نظر آئے گی جو دولت کمانے کی دھن میں پاگل ہو رہا ہے ـــــ اور اس پاگل پن میں اپنے فرائض ـــــ جو کہ ایک شوہر اور باپ کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں ـــــ انہیں جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا ہے۔

میں نے جس گھر میں جنم لیا وہ ایک غریب اور ایماندار اسکول ماسٹر کا گھر تھا۔ میرے پتا ساری زندگی اپنے اونچے آدرشوں کو گلے سے لگائے رہے۔ ان کی معمولی تنخواہ میں گھر کا خرچ بڑی مشکل سے چلتا تھا۔ اور مہینے کے آخری دنوں میں ـــــ ماں کا سلیقہ اور کفایت شعاری فیل ہو جاتی تھی ـــــ تب ہمارے گھر کا چولہا دن میں بس ایک بار جلتا تھا

۔۔۔روز، روز کی کھینچا تانی سے تنگ آ کر ماں ۔۔۔ پتا جی سے ٹیوشن کرنے کے لئے اصرار کرتی ۔۔۔ آخر اور بھی اسکول ماسٹر تھے۔ جو اپنی تنخواہ سے کئی گنا زیادہ کما رہے تھے۔ شام کے وقت ان کے گھروں پر باقاعدہ کلاس لگتی تھی ۔۔۔ جسے وہ ''کوچنگ اسکول کا نام دے کر عزت سے ہزاروں کما رہے تھے۔ لیکن میرے پتا اپنے گھر پر آ کر پڑھنے والے شاگردوں سے ایک پیسہ لینا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ وہ تو انہیں اپنی اولادوں کی مانند عزیز رکھتے تھے۔ اور ماں سے چوری چھپے اکثر ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ سو ہمارے گھر کی حالت سدھرنے کے بجائے دن بہ دن بگڑتی چلی گئی۔ کیونکہ ہم چار بھائی بہن ابھی زیرِ تعلیم تھے ۔۔۔ پتا جی مجھے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ مجھے ڈاکٹری پڑھنے کا شوق تھا ۔۔۔ لیکن ہر کام اگر محض شوق کرنے سے پورا ہو جاتا ۔۔۔ تو آج آرٹسٹ کو ہتھوڑا نہ چلانا پڑتا ۔۔۔ اور وہ ہاتھ جنہیں قلم تک پکڑنے کی تمیز نہیں تھی ۔۔۔ خود کو چغتائی اور حسین نہ سمجھتے ۔۔۔ اس لئے مجھے بھی اپنا دل مارنا پڑا ۔۔۔ اور 'بی ایس سی' کرنے پر اکتفا کی ۔۔۔ اور مجھے اس کا افسوس بھی نہیں تھا ۔۔۔ جو ملا وہ بھی کم نہیں تھا ۔۔۔ پتا جی کا سکھلایا ہوا قناعت کا سبق ہمیشہ ایسے موقعوں پر ہمارے کام آتا تھا۔ ہمارے کالج میں سالانہ فنکشن تھا ۔۔۔ ہر سال کی طرح اس بار بھی 'ڈبیٹ' میں مجھے فرسٹ پرائیز ملا تھا۔ جو صاحب چیف گیسٹ بنے تھے ۔۔۔ وہ تازہ تازہ 'ایم ایل اے' ہوئے تھے۔ شاید اس لئے زیادہ خوش نظر آ رہے تھے۔ مسٹر دیش مُکھ کے ہاتھوں سے انعام لیتے ہوئے مجھے پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ حضرت وہاں لڑکیوں کو تاکنے کے لئے آئے ہیں۔ دوسرے ہی دن انہیں اپنے گھر پر دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ میری ذہانت کی تعریفیں کر رہے تھے۔ اور اپنے خرچ پر مجھے اعلیٰ تعلیم دلانے پر اصرار کر رہے تھے۔ پتا جی نے انہیں بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا ۔۔۔ اور اگلے ہفتہ وہ میرا ہاتھ مانگنے آ گئے۔ میں جو دل ہی دل میں پتا جی کی بے جا خودداری پر جذبز ہو رہی تھی کہ ناحق دیش مکھ کی مالی امداد سے انکار کیا اب ان کی دوراندیشی کی قائل ہو گئی تھی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ یہ رشتہ فوراً منظور کر لیتے کہ مستقبل کا منتر خود چل کر ہمارے دروازہ پر رشتہ مانگنے آیا تھا۔ لیکن پتا جی نے انکار کر دیا۔ ماں کو بھی بُرا لگا ۔۔۔ پھر بھی وہ چُپ رہیں ۔۔۔ کہ پتا جی کے فیصلے سے اختلاف

کرنا ان کے دھرم اور سنسکاروں کے خلاف تھا۔

انہیں دونوں راکیش ملہوترا نے مجھے کسی شادی میں دیکھا تو اپنا رشتہ بھیج دیا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اور چھوٹے موٹے ٹھیکے لیتا تھا۔ پتا جی اس کے کام کرنے کی لگن سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ محنتی لوگوں کو پسند کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ محنتی نوجوان ہی اس دیش کے معمار ہیں۔ راکیش کا تعلق کسی مالدار گھرانے سے نہیں تھا۔ وہ لوگ بھی ہماری طرح غریب اور ایماندار تھے — راکیش نے اپنی محنت سے اتنی ترقی کی تھی۔

دو چار ملاقاتوں کے بعد رشتہ طے ہو گیا اور میں پونم ملہوترا بن کر اس کے چھوٹے سے بنگلہ میں آ گئی راکیش ایک محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا — میں بہت خوش تھی — وہ میرے آرام کا ہر پل خیال رکھتا تھا — اور دن رات محنت کرتا تھا تا کہ مجھے ایک پر آسائش زندگی دے سکے۔

ایک دن وہ بہت خوش خوش گھر آیا — اسے بہت بڑا ٹھیکہ ملنے کی امید تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اسے یہ ٹھیکہ مل گیا تو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے — بشرطیکہ مسٹر دیش مکھ خوش ہو جائیں اور ان کی خوشی کی شرط ان کی کمینی فطرت کے عین مطابق تھی — شاید انہیں پتہ چل گیا تھا کہ راکیش میرا پتی ہے — اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتے تھے — میں نے راکیش کو ہر بات بتا دی لیکن وہ کچھ سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ پہلے تو وہ میری خوشامد کرتا رہا — دولت کے سبز باغ دکھاتا رہا — اس پر بھی میں نہ مانی تو اس نے جم کر میری پٹائی کی — اور جب میں اپنے سوجے ہوئے چہرہ پر ڈھیروں میک اپ تھوپ کر دیش مکھ سے ملنے گئی تو وہ خبیث دانت نکال کر ایسے ہنسا جیسے بھیڑیا حملہ کرنے سے پہلے باچھیں چیر کر اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔

راکیش کو ٹھیکہ مل گیا — اور سچ مچ اس کے وارے نیارے ہو گئے — نیا بنگلہ — نئی کار — اور بھی نہ جانے کیا کیا آ گیا — وہ بہت خوش تھا — دولت حاصل کرنے کی کنجی جو اس کے ہاتھ آ گئی تھی — اور میں جو اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ اس کے بعد راکیش کی کوئی بات نہیں مانوں گی — تو یہ میری بھول تھی — راکیش کو دولت کمانے کی دھن سوار تھی — وہ ایک کے

بعد دوسرا ٹھیکہ حاصل کرتا گیا۔ اور میں اپنے ہی گھر میں بازاری عورتوں کی طرح ننگی بانہوں اور مصنوعی مسکراہٹوں کی نمائش کرتے ہوئے پارٹی میں آنے والے مردوں کی بیباک نظروں، پُر مذاق اور بیہودہ فقروں کے تیروں سے چھلنی ہوتی رہی۔۔۔ میں نے اس زندگی سے تنگ آ کر راکیش کو چھوڑنا چاہا۔۔۔ کئی بار خودکشی کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔۔۔۔ لیکن بچّوں کی محبت نے میرا دامن تھام لیا ان کی ممتا نے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔۔۔ نہ میں کہیں جا سکی اور نہ ہی مَر سکی۔۔۔ اور میک اپ سے لپے پُتے چہرہ پر مصنوعی مسکراہٹیں سجائے اپنے خوش ہونے کا ثبوت دیتی رہی۔۔۔

میری بیٹی کاجل بہت خوبصورت ذہین اور بھولی بھالی ہے۔ میں خود تو ڈاکٹر نہ بن سکی۔ اب اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنا کر اپنے دیرینہ خواب کی تعبیر پانا چاہتی تھی۔ کاجل کو بھی ڈاکٹری پڑھنے کا شوق تھا۔ اور میری طرح اس کے شوق کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ آخر اس کے باپ کی اتنی دولت اور تعلقات کس دن کام آتے سوا سے میڈیکل میں داخلہ مل گیا۔ کاجل سے چھوٹا بیٹا راجیش نینی تال کے شیرؤڈ کالج میں زیرِ تعلیم ہے۔ ہر ماں کی طرح میں نے بھی اپنے بچّوں کی بہتر زندگی اور کامیاب مستقبل کے سپنے دیکھے تھے۔ اور ان سپنوں میں سنہرے روپہلے رنگ بھرے تھے۔ میں نے ان کی تربیت اور تعلیم پر پوری توجہ دی تھی۔۔۔ اور میں نے راکیش کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اب اس کی بے ہودہ پارٹیاں گھر پر نہیں ہوں گی کیونکہ میرے بچّے سمجھ دار ہو رہے ہیں۔

اب وہ ایسی دعوتیں اور پارٹیاں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں دیتا تھا۔۔۔ اور میں اس کی خوشی کے لئے میزبانی کے فرائض اسی طرح انجام دیتی تھی۔۔۔ مجھے تو اب اس بات کی بھی پروہ نہیں تھی کہ وہ باہر کیا کرتا ہے۔ اور کہاں جھک مارتا ہے۔ جوان بچّوں کی ماں ہونے کا اپنا ایک الگ ہی سُرور ہوتا ہے۔ ایک عجیب سا نشہ ہوتا ہے۔ میں بھی اسی نشے میں سرشار رہتی تھی۔۔۔ خصوصاً اپنی بیٹی کے معاملہ میں بے حد حسّاس تھی۔

راکیش نے دو ایک بار کاجل کو بھی کسی فنکشن میں اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔۔۔۔ تو میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ اور تب سے میں کسی جنگلی بلّی کی مانند ہوشیار رہنے لگی تھی۔۔۔ جو

شکاری جانوروں کے ڈر سے اپنے بچّوں کو ہر وقت اپنے نزدیک اور اپنی نظروں کے سامنے رکھتی ہے۔ مبادا کوئی جانور انہیں گزند نہ پہنچائے۔

میرا بیٹا راجیش بیمار ہوا تو اسکول کی طرف سے اس کی بیماری کی اطلاع پا کر میں نینی تال بھاگی۔ اوپر والے کا شکر تھا کہ وہ اب بہتر تھا — اور دو روز کے آرام کے بعد ہاسپٹل سے اپنے ہوسٹل منتقل ہونے والا تھا — میں مطمئن ہو کر گھر لوٹ آئی — خلافِ معمول گھر میں سناٹا تھا — کاجل موجود نہیں تھی — ملازمہ نے بتایا کہ صاحب اسے اپنے ساتھ کہیں لے گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی میری کنپٹیاں سُلگ اٹھیں — غصّے، نفرت اور غیرت سے میرا برا حال ہو گیا۔ ملازم بے چارے کیا بتاتے کہ صاحب کہاں گئے ہیں۔ اور کس کی مجال تھی جو ان سے یہ سوال کرتا —

میں نے گھبرا کر اپنے کئی ملنے والوں کو فون کیا تب کہیں جا کر پتہ چلا کہ مسٹر دیال کے گھر 'ڈنر' ہے — مسٹر دیال محکمۂ تعمیرات میں ایک اہم عہدہ پر فائز تھے — اور نہایت کمینے انسان تھے — اِن دنوں راکیش ان کے پیچھے لگا ہوا تھا — میں ستر اسّی کی رفتار سے گاڑی چلاتی ہوئی مسٹر دیال کی کوٹھی پر پہنچی — اور اندر داخل ہونے کے لئے مجھے اپنے ذلیل پتی کا حوالہ دینا پڑا — دعوت کیا تھی — بس گنتی کے چند لوگ تھے — اُن میں راکیش ملہوترا بھی تھا — اور میری بیٹی — میری معصوم بچّی کاجل دیال کے پہلو میں سمٹی اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی — اور رحم طلب نظروں سے اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی — جو دیدہ و دانستہ اس سے نظریں چرائے کسی اور سے محوِ گفتگو تھا — اور یہی وہ لمحہ تھا جب صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا — میں نے اب تک بہت صبر کیا تھا — لیکن اب نہیں — اور میں نے پستول کی ساری گولیاں راکیش کے سینے میں اتار دیں — کاجل مجھ سے لپٹی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی — اللہ جانے باپ کی موت پر یا پھر غیر متوقع اپنے بچ جانے پر — اور میں اسے اپنے کلیجے میں بھرے یوں مطمئن اور آسودہ کھڑی تھی جیسے آج میں نے کاجل کو ہمیشہ کے لئے زمانہ کی بری نگاہوں سے محفوظ کر لیا ہو —

مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی ہوئی یہ پونم ملہوترا آج اتنی ہلکی پھلکی، آسودہ اور

مطمئن ہے جتنی شادی کے پہلے اپنے غریب باپ کے گھر میں رہتی تھی — بیٹی کی نظروں میں سُرخرو ہونے کی خوشی نے اپنی موت کا غم بھی بھلا دیا تھا اب اسے ہر سزا قبول تھی کیونکہ کوئی بھی سزا — اُس سزا سے زیادہ نہیں ہوسکتی — جو اُس نے راکیش کے ساتھ رہ کر بیس سال بھگتی تھی — اور یہ گھناؤنی سزا راکیش کی موت پر ہی ختم ہوسکی — اگر وہ زندہ رہتا تو شاید سزاؤں کا یہ سلسلہ اس کی بیٹی — اور پھر خاندان کی ہر بیٹی تک چلتا رہتا — اس لئے اس نے گناہ کے اس پودے کو ہی جڑ سے اکھاڑ پھینکا — اگر گناہ کو ختم کرنا گناہ ہے — تو وہ گنہگار ہے — اگر برائی کو ختم کرنا جرم ہے — تو وہ مجرم ہے۔ اور اپنے سچ کا اعتراف وہ پہلے ہی کر چکی ہے کہ راکیش کا قتل اس نے کیا ہے —

اور وہ بڑے فخر سے اعتراف کرتی ہے کہ وہ راکیش کی قاتل ہے —



کَرن پھول

پہلی بار اماں کی شربتی آنکھوں میں سفید بادل کے پَرے اس دن اترے ——
جب ان کی گود کے پالے سرحد پار کر کے اجنبی ملک سدھارے تھے — پھر تو ان سفید بادلوں نے ان کی جگ مگ کرتی آنکھوں میں مستقل ڈیرہ جمالیا — وہ بار بار دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں صاف کرتیں۔ لمحہ بھر کو یہ بادل ہٹتا — دوسرے پل پھر جالا بن کر پتلیوں پر تن جاتا اور آنکھوں کی جگمگاہٹ ان کی اوٹ میں چھپ جاتی — شاید یہ اس لئے تھا کہ جن آنسوؤں کو بہنا تھا — وہ خشک ہو کر جَم گئے تھے —

اماں کی آنکھ سے آنسو تو اس دن بھی نہیں گرے تھے جب میاں کی خبر آئی تھی —
روز کی طرح وہ اس دن بھی اچھے بھلے گھر سے گئے تھے — سفید براق کھدّر کا کرتا پاجامہ زیب تن کئے تھے — سفید گاندھی ٹوپی ذرا سی ترچھی ہو کر ان کے بانکپن میں اضافہ کر رہی تھی — اور وہ نظر لگنے کی حد تک اچھے لگ رہے تھے — زیرِلب دعائیں پڑھ کر انہوں نے میاں پر پھونک ماری — اور ان کی سلامتی کی دعائیں مانگ کر مطمئن ہو گئیں۔ لیکن شاید قبولیت کی گھڑی اس دم دور کھڑی تھی —— کہ بس دو گھنٹہ کے بعد میاں کی خون میں لت پت لاش گھر آ گئی۔ انہیں سکتہ ہو گیا — آج وہ کبھی نہ جانے کے لئے گھر آئے تھے —— لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے — وہ تو جب سے بیاہ کر آئی تھیں — انہیں ٹِک کر گھر میں بیٹھتے نہیں دیکھا تھا — آج گاندھی جی کے ساتھ ہیں تو کل پنڈت جی کے ہمراہ — ایک پاؤں گھر میں ہے تو دوسرا جیل میں — وہ اپنے وطن کو فرنگیوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے پاگل تھے — اور

وہ میاں کی دیوانی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ مہینوں گھر نہ آتے اور جب آتے تو کئی دن جھینپے جھینپے رہتے۔ وہ کرید کرید کر جلسوں کا حال پوچھتیں۔ گاندھی جی اور پنڈت جی کے بارے میں ایک ایک بات دریافت کرتیں—تب کہیں جا کر ان کی شرمندگی دور ہوتی۔ وہ بڑے خلوص سے وعدہ کرتے کہ اس بار وہ لمبی مدت تک ان کے پاس رہیں گے۔ لیکن بلاوا آتے ہی وہ سب کچھ بھول بھال کر بھاگے چلے جاتے۔ انہیں میاں پر پیار آجاتا—انہیں تو میاں سے نہ پہلے کبھی شکایت تھی نہ اب ان کے جانے کے بعد کوئی شکوہ تھا—شکوہ اگر تھا تو بس اوپر والے سے تھا۔ کیا تھا جو وہ کچھ دن اور جی جاتے جس آزادی کا خواب دیکھتے ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ گزرتا تھا—اس خواب کی تعبیر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے—ان کے پیچھے ان پر کیسی کیسی مصیبتیں پڑیں—لیکن وہ صبر و شکر سے سب کچھ جھیل گئیں—چاہنے والے سسُر—اور جان وارنے والی ساس بیٹے کے غم میں زندہ درگور ہوگئیں اور دونوں بہت جلد بیٹے سے جا ملے——انہوں نے یہ صدمہ بھی برداشت کیا۔ تینوں بیٹوں کی پرورش اور تربیت اس طرح کی کہ مرحوم شوہر کے سارے خواب انہیں سونپ دیئے—لیکن جب منجھلے اور چھوٹے نے ہجرت کا فیصلہ کیا——تو وہ ہفتوں گُم صُم رہیں—انہیں یقین آگیا کہ ان کی تربیت میں کہیں کوئی کمی ضرور رہ گئی ہے—ورنہ وہ اس طرح اپنا گھر اور اپنا وطن چھوڑ کر نہ جاتے خدا بھلا کرے بڑے بھیا کا—جو باپ دادا کی ڈیوڑھی چھوڑ کر نہیں گئے—اور بزرگوں کی وراثت کو قیمتی امانت سمجھ کر سنبھالا—

لمّاں سہ دری میں اپنی نواڑی پلنگڑی پر آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔ سامنے کئی جگہ اینٹوں کا ملبہ اور ستونوں کے پتھر بکھرے پڑے تھے—کل کا محل آج کھنڈر ہوگیا تھا—بس چند کمرے اور دالان ہی سلامت رہ گئے تھے—سو وہ بیٹے اور بہو کو سونپ دئے تھے۔ اور خود اس سہ دری میں سمٹ آئی تھیں—انہیں اب زیادہ جگہ کی ضرورت بھی نہیں تھی—ایک پلنگڑی—ایک نماز کی چوکی—اوپر تلے دھرے ہوئے دو بکس—اور لوہے کی بھاری الماری—بس یہی ان کا کل اثاثہ تھا—نہ محل سلامت تھا—نہ محل کے مکین زندہ تھے—نہ ملازموں کی فوج تھی—نہ رشتے داروں کا ہجوم۔ اللہ اللہ سب کچھ ختم ہوگیا۔ اور گھر کی تباہی و بربادی دیکھنے

کے لئے وہ خود زندہ رہ گئیں۔

بڑے بھیا کچہری سے آئے تو گھر میں سناٹا دیکھ کر سیدھے ان کے پاس چلے آئے۔ آہستہ سے کہا۔

''امّاں آپ کی طبیعت کیسی ہے۔۔۔ بے وقت آرام کر رہی ہیں؟'' ''بس بیٹا یوں ہی لیٹ گئی۔ تم منہ ہاتھ دھولو میں کھانا لگاتی ہوں''۔

امّاں نے پاؤں سے ٹٹول کر جوتی پہنی اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئیں۔

''یہ سب لوگ کہاں گئے؟''۔

انہوں نے بیوی اور بچّوں کے بارے میں پوچھا۔۔۔ ''آمنہ دلہن گھر گئی ہیں''

''جب دیکھو تب گھر۔۔۔ یہ گھر نہیں جنگل ہے کیا؟''۔

بڑے بھیا کو بیوی کا دوڑ دوڑ کر میکہ جانا پسند نہیں تھا۔

''ارے بھیا ناراض نہ ہو۔ دلہن کے بھائی بھاوج ولایت سے آئے ہیں۔ ان سے ملنے چلی گئیں۔ بس آتی ہی ہوں گی''۔

اماں نے سہ دری سے ملے ہوئے دالان میں تخت پر دسترخوان بچھایا۔ اور کھانا لگا دیا۔

''امّاں! آپ نے کھانا نوش کیا؟''۔

بڑے بھیا نے دسترخوان پر بیٹھ کر ماں سے پوچھا۔۔۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا ۔۔۔ اور اماں ان کی سعادت مندی پر نہال ہو جاتی تھیں۔ تخت کے کونے پر ٹک کر اماں نے پانی کا جگ اور مراد آبادی کٹورہ لا کر رکھ دیا۔۔۔ کہا۔

''ہاں میاں میں کھا چکی تم بسم اللہ کرو''۔

بڑے بھیا نے بے دلی سے کھانا کھایا۔ خود ہی دسترخوان بڑھایا۔۔۔ اور ماں کو آرام کرنے کی تاکید کر کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اماں بھی کچھ دیر سونے کے خیال سے لیٹ گئیں۔ کروٹ لی تو کان کی لو دب گئی اور نیم کا تنکا چبھنے لگا۔۔۔ میاں کے بعد زیور تو پہننا چھوڑ ہی دیا تھا۔ بس کان میں نیم کے تنکے ڈال لئے تھے۔ جو کروٹ لینے پر اکثر چبھ جاتے تھے پہلے کیا مجال تھی جو کبھی ناک کان اور ہاتھ گلا ننگا رہ جائے۔ ساس انہیں اپنے سامنے سارا

زیور پہناتی تھیں۔ منیہارن ہر پندرہویں دن چوڑیاں بدل دیتی تھی۔ اتاری ہوئی چوڑیاں بڑی احتیاط سے ہری دوب اور پیسے ڈال کر سرخ طول کی تھیلی میں کر کے دریا میں سیرا دی جاتی تھیں — کہ سہاگن کی چوڑیاں ادھر اُدھر نہ پڑی رہیں چوڑیوں کا ٹوٹنا بدشگونی سمجھا جاتا تھا۔ جیسے جیسے بیٹوں کی شادی ہوتی گئی، زیور بہوؤں کو چڑھاوے میں دے دیا بس ہیرے کے جڑاؤ کرن پھول روک لئے۔

شادی کی پہلی رات میاں نے یہ کرن پھول انہیں رونمائی میں دئے تھے — بلکہ اپنے ہاتھ سے پہنائے تھے۔ سارے خاندان میں کسی کے پاس ایسے خوبصورت اور قیمتی کرن پھول نہیں تھے۔ وہ بھی انہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ اس لئے نہیں کہ اس میں ہیرے جڑے تھے۔ اصل قیمت تو اس یادگار لمحے کی تھی جب میاں نے بڑے چاؤ سے انہیں کرن پھول پہنائے تھے۔ اس کے بعد ان کی زندگی میں چاہت کا وہ لمحہ پھر کبھی نہ آیا۔ میاں کو چاؤ چونچلوں کی فرصت ہی نہیں تھی۔ بس جسے تیسے ازدواجی زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ وہ تو غنیمت تھا کہ ساس سسر زندہ تھے۔ اور ان کا مان گون بھی خوب کرتے تھے۔ ان کے لئے یہی کیا کم تھا کہ شوہر نے ان کے سوا کسی اور پر نظر نہیں ڈالی — نہ رئیسوں کے شوق اپنائے بلکہ خاندانی روایات کے برعکس ایک بھرپور اور فعال زندگی جی۔ مرے تو اس طرح کہ وطن پر شہید ہونے والوں میں ان کا نام لکھا گیا۔

یادوں کا ریلا چلا تو اماں کو وہ دن یاد آ گیا۔ اس روز شہر میں بہت بڑا جلسہ ہونے والا تھا۔ جس کی تیاریاں کئی دن سے ہو رہی تھیں۔ جلسہ گاہ کا وسیع وعریض میدان دلہن کی طرح سجا تھا۔ جھنڈیاں اور بینر، گیندے کے پھولوں سے آراستہ ڈائس اور جگہ جگہ مشہور لیڈروں کی تصاویر دیکھ کر جلسے کی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا — میاں کئی دن سے مصروف تھے۔ ان کی تقریر کا منفرد انداز جلسوں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ جلسہ شروع ہوا۔ کئی لیڈروں نے تقریر کی۔ ان کی باری آئی تو فضا انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ تقریر کے دوران مجمع زوردار تالیاں بجا کر اپنے جوش وخروش کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ جیسے ہی تقریر کر کے ڈائس سے نیچے اُترے، ہجوم نے انہیں گھیر لیا۔

''فرنگیوں واپس جاؤ''

''تاناشاہی نہیں چلے گی''

''گوراشاہی نہیں چلے گی''

''انقلاب زندہ باد''—

ہجوم کے پُر جوش نعروں میں گولی کی آواز دب گئی۔ کسی اَن دیکھے ہاتھ نے بہت قریب سے ان کے سینے میں گولی اتاردی— اور آنِ واحد میں سب کچھ ختم ہوگیا۔ دیس کو آزاد ہونا تھا سو ہوگیا۔ میاں اور ان کے جیسے نہ جانے کتنے آزادی کے متوالے ملک پر قربان ہو گئے۔

اچانک گھر کا سناٹا آمنہ دلہن اور بچّوں کی آوازوں سے ٹوٹ گیا۔ اماں نے ٹھنڈی سانس لی۔ اور خیالات کے گرداب سے باہر نکل آئیں۔ آمنہ دلہن بڑے بھیا سے کہہ رہی تھیں۔

''یہ دیکھئے— بھائی صاحب ہمارے لئے کتنے اچھے تحفے لائے ہیں۔ ولایتی گرم سوٹ کا کپڑا آپ کے لئے ہے۔ میرے سوٹوں کے لئے اصلی ریشم اور سِلک ہے۔ یہ فَر کا کوٹ بھی میرا ہے۔ بچوں کے لئے گرم سوٹ اور کھلونے ہیں۔ بجلی کا شیونگ سیٹ اور پارکر پین بھابھی نے خاص طور پر آپ کے لئے دیا ہے۔ ان کا البم دیکھ کر تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ بڑی تو گاڑی ہے ان کی اور گھر ایسا خوبصورت ہے جیسے پریوں کا محل۔ نہانے کا تالاب تک ہے ان کے گھر میں۔ بھابھی کہنے کو انگریز ہیں لیکن غرور نام کو نہیں ہے۔ اب ہمارے گھر میں انھیں اپنے گھر جیسا آرام بھلا کہاں مل سکتا ہے۔ اسی لئے بھائی صاحب اور بھابھی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔''

''بس چپ رہو۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے''

بڑے بھیا نے بے زاری سے کہا اور کروٹ بدل لی۔ ''میرے بھائی کی تعریفیں سن کر سر میں درد ہونے لگا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ بھائی صاحب کی ترقی اور کامیابی آپ کو پسند نہیں آئی۔ ہمیشہ میرے میکے والوں کو خود سے کمتر سمجھا— اور اپنے اس کھنڈر پر ایسا اتراتے ہیں جیسے سچ مچ کا راج محل ہو۔ اب محل کہہ دینے سے یہ محل تو ہونے سے رہا۔ بے چارہ محل''—

آمنہ دلہن کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ بڑے بھیا کی خاموشی ان کے غصّے کو ہوا دے رہی تھی۔ اور اماں سوچ رہی تھیں کہ دلہن کہتی تو سچ ہیں۔ پچاسوں برساتیں اور گرم و سرد جھیلنے کے بعد ـــــ بغیر مرمّت اور رنگ و روغن کے کب تک یہ محل کھڑا رہ سکتا تھا۔ اسے تو کھنڈر ہونا ہی تھا۔ اکیلے بڑے بھیّا بے چارے کیا کیا کرتے۔ وہ دونوں ہوتے تو تینوں بھائی مل کر محل کی بنیادوں کو سہارا دیتے۔ لیکن بُرا ہو ان کا جو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر بیٹھ گئے۔ اور خون کو خون سے جدا کرنے کا سامان کر گئے۔ ان کی ضد پوری ہوگئی اپنا علیحدہ ملک بنا لیا۔ دوسروں کے گھر اُجڑ گئے یہ کسی نے نہ دیکھا۔ بڑے بھیّا آج تک زمینوں کے مقدّمے جھیل رہے ہیں۔ تھوڑی سی جائیداد کرائے پر نہ چڑھی ہوتی تو خدا جانے کیا ہوتا ـــ

اماں نے اٹھ کر کلّی کی۔ پٹاری کھول کر پان کے ننھے سے ٹکڑے پر کتّھا چونا لگایا چند دانے چھالیہ کے ڈال کر پان منہ میں رکھ لیا۔ تکیہ برابر کیا تو ہاتھ چابیوں کے گچھے سے ٹکرا گیا۔ چابیوں کا یہ بھاری سا گچھا کئی یادوں اور رازوں کا امین تھا ـــ اور وہ ان ساری یادوں اور رازوں کی تنہا امین تھیں۔ وہ ایک ایک چابی کو چھو کر دیکھتیں اور ان کے لمس سے سرشار ہو کر احساس کی نرم لہروں پر بہتی رہتیں ـــ

''یہ چابی بڑے کمرے کی ہے'' اماں نے ایک چابی الگ کی۔ ''اس کمرے میں ماں حضور (ساس) گھر کا قیمتی سامان رکھتی تھیں ـــ بڑے بڑے چوبی صندوقوں سے کمرہ بھرا ہوا تھا ـــــ اور یہ پیتل کی چابی ـــ؟'' انہوں نے چابی کو آنکھوں کے قریب لا کر دیکھا ـــ ''یہ امام باڑے کی چابی ہے۔'' بندے علی سوز خوان جس وقت مرثیہ پڑھتے تھے ـــ ان کی آواز کا درد اور لہجے کا اتار چڑھاؤ سخت سے سخت دل کو گداز کر دیتا تھا۔ ہر آنکھ نَم ہو جاتی تھی۔ اور گریہ وزاری سے امام باڑے کی فضا گونج اُٹھتی تھی۔ اس وقت بھی ان کی آنکھیں نم ہو گئیں قریب سے بندے علی سوز خوان کی آواز اُبھری ـــ

''کربلا میں شہہ والا کے حرم لٹتے ہیں'' ـــ

''ـــــ یہ تو کربلا نہیں ہے۔ پھر ہم کیوں لٹ گئے؟۔ سہاگ چھنا ـــ بیٹے جدا ہوئے۔ عزت، دولت، خوشی اور سکون سب داستانِ پارینہ بن گئے۔ رہے نام اللہ کا ـــ''

ایک ایک چابی سرکتی رہی۔ اور ان سے وابستہ ہر کردار ——— ہر واقعہ جیتا جاگتا ان کی آنکھوں کے سامنے سے گذرتا رہا—— ٹھنڈی سانس لے کر اماں نے چابیوں کا گچھا تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اچانک تھکن کا ایسا غلبہ ہوا کہ بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں—— ''اللہ ہو اکبر—— اللہ ہو اکبر''——

''اماں مغرب کی اذان ہو رہی ہے''——

بڑے بھیا نے انہیں سوتا جان کر آواز دی——

''اچھا بیٹا ابھی اٹھ کر وضو کرتی ہوں''——

اماں کی نیند تو برسوں سے غائب تھی—— بس ذرا کی ذرا جھپکی لی—— اور سونے کی رسم پوری ہو گئی۔ یادوں کے ریلے یہاں وہاں گھومتے پھرتے—— اور رات کروٹیں بدلتے گذر جاتی۔ بڑے بھیا کے اصرار کے باوجود انھوں نے رات میں کھانا نہیں کھایا۔ دونوں پوتے ان کے داہنے، بائیں آکر لیٹ گئے——

''دادی اماں کہانی سنایئے''——

''جادو کے اُڑن کھٹولے کی کہانی''——

''نہیں—— سات شہزادیوں کی کہانی''——

اماں کو بھی اب کوئی کہانی پوری یاد نہیں تھی—— بس اِدھر اُدھر سے ٹکڑے جوڑ کر بچوں کو بہلا دیتیں—— کہانی شروع کی——

''ایک تھا بادشاہ—— ہمارا تمہارا خدا بادشاہ''——

''تم چاہتی ہو کہ میں ایک فرنگن کے سامنے پلیٹیں سجاؤں؟'' اس کی خاطر مدارات کروں—— تو کان کھول کر سن لو! یہ ناممکن ہے۔ اس گھر میں ابا کے اصول، ان کی آن بان اور ان کی حُبّ الوطنی کا جذبہ زندہ ہے۔ کچھ نہیں ختم ہوا—— یہاں کوئی فرنگن قدم نہیں رکھ سکتی۔ نہ یہاں غدّاروں کے لئے کوئی جگہ ہے''——

بڑے بھیا کی دھاڑ خدا کی پناہ—— اماں کہانی بھول گئیں—— آمنہ دلہن کیوں چُپ رہتیں چیخ کر بولیں—— ''کیا صلہ ملا آپ سب کو حُبّ الوطنی کا۔ ابا نے ساری دولت ملک اور

قوم پر لٹا دی— نتیجہ کیا ملا— ؟ شہید کر دیئے گئے۔ گاؤں اور زمینیں—خاتمۂ زمینداری بل پاس کر کے چھین لی گئیں۔ بھائیوں کا حصّہ کسٹوڈین نے دبا لیا— بچی کھچی سیر کی زمین مقدموں میں پھنسی ہے کچہری کے چکّر لگاتے زندگی گذری جا رہی ہے— لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔''—

''تم جو چاہے سمجھو! ہمارے ضمیر مطمئن ہیں۔ سر اٹھا کر جیتے ہیں۔ کسی کے شرمندہ احسان نہیں ہیں۔ ہماری اماں نے حکومت سے پنشن لینا تک گوارہ نہیں کیا''—

''بڑی عقل مندی کی۔'' آمنہ دلہن نے طنز کیا۔

''دادی اماں— ہمارا تمہارا خدا بادشاہ''— پھر کیا ہوا؟ ''ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ فرنگی جاتے جاتے اپنی چال چل گیا۔ میاں زندہ ہوتے تو اس صدمے سے مر ہی جاتے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کسی بھلے مانس نے انھیں گولی مار کر پہلے ہی ختم کر دیا۔ انھوں نے بھلا کب سوچا ہوگا کہ آزادی کی اتنی بڑی قیمت چکانا پڑے گا۔ اور منجھلے اور چھوٹے دونوں اس کی بھینٹ چڑھ جائیں گے''—

دادی کہانی سنا رہی تھیں—دونوں پوتوں نے ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور مایوسی سے سر ہلا کر چپ ہو گئے۔ اب تو دادی کہانی سناتے سناتے بہک جاتی تھیں— اور نہ جانے کیسی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتی تھیں—

اماں کی سوچ اس وقت بھی سرحد کے آس پاس بھٹک رہی تھی— ''پہلے تو سب نے آزادی کا راگ الاپا— جب آزادی مل گئی تو ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ وہ بھی چپ چپاتے نہیں۔ اِدھر سے اُدھر جانے والے۔ اور اُدھر سے اِدھر آنے والے— خون کی ندیاں پھلانگ کر منزل تک پہنچتے— میاں اور ان جیسے سینکڑوں لوگوں کی قربانی رائیگاں گئی۔

بڑے بھیا نے خوشی، خوشی اماں کو خط دکھایا— ''اماں— منجھلے اور چھوٹے اگلے ہفتہ گھر آ رہے ہیں'' ''جم جم آئیں! اپنے گھر آنا مبارک ہو۔ بڑے بھیا— کوشش کرنا کہ دونوں اب واپس نہ جائیں''

اماں نے بڑے مان سے کہا— بڑے بھیا اماں کو کیسے سمجھاتے کہ ایسا ہونا ناممکن

ہے۔بس خاموش رہ کر گویا ماں کی تائید کی۔اماں نے بے چینی سے ایک ہفتہ گذارا— اور جب بیٹے آئے تو انھیں سینے سے لگا کر اتنا روئیں جیسے بادل پھٹ جانے کے بعد موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ان کے ایک ایک آنسو میں سیکڑوں شکوے چھپے تھے— گھر میں چہل پہل ہوگئی— اور اماں بھی بہل گئیں— عرصے کے بعد گھر کا سناٹا اور خالی پن دور ہوا تھا۔نہ کچھ سوچنے کا وقت ملتا تھا۔نہ چُپ چاپ لیٹنے کی فرصت تھی۔رات میں بچے گھیر کر بیٹھتے تو انھیں بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتیں— نہ بہکتیں— نہ اُلجھتیں— بڑے بھیا بھی سب کی خاطر مدارات میں بچھے جا رہے تھے— آمنہ دلہن بھی بظاہر ہنسی خوشی دیوروں اور دیورانیوں اور ان کے بچوں کی خاطریں کر رہی تھیں۔لیکن دل ہی دل میں کُلس رہی تھیں کہ ان کے بھائی بھاوج کو تو ایک پیالی چائے کو نہ پوچھا— اور اپنوں پر میاں جی واری صوتے ہو رہے ہیں—

دو ہفتے ہنسی خوشی گذر گئے— تیسرے ہفتے گھر کا ماحول کچھ سنجیدہ ہو گیا۔تینوں بھائی خدا جانے کس مسئلے پر دن رات سر کھپا رہے تھے— لمبی لمبی بحثیں ہوتیں لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلتا— اس رات بھی تینوں سنجیدگی سے باتیں کر رہے تھے—

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے— لیکن اماں اس معاملہ میں ایک لفظ سُننا گوارا نہیں کریں گی''

بڑے بھیا نے رَسان سے کہا—

''بڑے بھیا بات دراصل یہ ہے کہ جو لوگ شروع میں چلے گئے وہ جَم گئے۔مشکل ہمارے جیسے لوگوں کی ہے۔نہ ڈھنگ کی ملازمت ملتی ہے نہ ہی اتنا پیسہ ہے کہ کوئی کاروبار ہی کر سکیں۔''

چھوٹے نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہم تو بڑی امیدیں لے کر آئے تھے— کہ آپ ہماری مدد کریں گے''—

''مجھے بھی کب انکار ہے نہ میں تم لوگوں سے باہر ہوں۔لیکن میرے حالات بھی تم لوگوں سے چھپے نہیں ہیں''—

''میں نے دو ایک لوگوں سے بات کی ہے۔وہ اچھے پیسے دینے کے لئے تیار

ہیں — صرف زمین ہی کئی لاکھ کی ہے — ملبہ الگ ہے —

''بڑے بھیا اگر ایسا ہو جائے تو آپ کے حالات بھی بدل جائیں گے۔''

چھوٹے نے مستقبل کا خواب دکھایا —

''وہ تو سب ٹھیک ہے بھائی۔ لیکن اماں نہیں مانیں گی — اور اس عمر میں انھیں یہ صدمہ دینا کچھ مناسب نہیں ہوگا۔ بلکہ بڑی خود غرضی کی بات ہوگی''—

بڑے بھیا نے انہیں ماں کے دکھ کا احساس دلایا —

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مایوس ہو جائیں''—

''دعا کرو زمینوں کا فیصلہ جلد ہو جائے۔ انشاء اللہ میں ضرور کچھ کروں گا —'' بڑے بھیا نے تسلی دی —

''برسوں گذر گئے — آج تک تو فیصلہ ہوا نہیں''—

منجھلے نے مایوسی ظاہر کی —

''اگر دس پندرہ برس فیصلہ نہ ہوا تو کیا اس وقت تک ہم لوگ بھیک مانگیں گے؟'' چھوٹے نے تلخی سے کہا —

''اللہ نہ کرے — بہر حال تم لوگ خود اماں سے بات کر لو — میں اتنا حوصلہ نہیں کر سکتا''

بڑے بھیا نے بات ختم کر دی —

ٹکٹ آگئے تھے۔ دونوں بھائیوں کی روانگی اگلے دن تھی۔ بڑے بھیا نے اپنی بساط سے بڑھ کر سب کو تحفے دیئے تھے۔ پھر بھی انہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس افسردہ کر رہا تھا — وہ تو ان کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے — لیکن حالات سے مجبور تھے — دونوں بھائی چُپ چُپ سے تھے — ان کی خاموشی بڑے بھیا کا دل چیرے ڈال رہی تھی — بھاوجیں بھی سوٹ کیس میں بنارسی ساڑیاں اور چکن کے سوٹ رکھنے کے باوجود خوش نہیں تھیں —

اماں کئی دن سے بولائی بولائی پھر رہی تھیں — ان کی بے قراری دیکھ کر سب کا دل کٹا جا رہا تھا — لیکن جانے والوں کو روکنا کسی کے بس میں نہیں تھا — وہ تو جانے کے لئے ہی

آئے تھے — پرندے آشیانہ بدل لیں تو پرانے گھونسلے اپنی کشش کھو دیتے ہیں۔
بڑے بھیا نے سُرخ مخمل کی کارچوبی تھیلی۔ جس کا کام ماند پڑ چکا تھا۔ منجھلے بھیا کے حوالے کی کہا..................

"اماں نے کہا ہے اسے رکھ لو—" اور چپ چاپ واپس چلے گئے۔ منجھلے نے بڑے اشتیاق سے تھیلی کھولی۔ اگلے پل ان کی مُرتعش انگلیوں کے درمیان ہیرے کے جڑاؤ کرن پھول جگمگا رہے تھے— انھیں تو سکتہ ہو گیا۔ چھوٹے بھی حَق دَق ہو گئے۔
"کڑے وقتوں میں بھی اماں نے انھیں خود سے جدا نہیں کیا— کیا آج ان پر اتنا بُرا وقت آ گیا ہے کہ اماں ———" "نہیں نہیں—" منجھلے نے کُرتے کی آستین سے آنکھیں— رگڑیں۔ کرن پھول تھیلی میں رکھ کر ڈوری باندھی— اور چھوٹے کا ہاتھ تھام کر اماں کی سہ دری کی طرف بڑھ گئے—



تُم بھی

''یہ گھر ایک عام سا گھر نہیں تھا''

یہ تو ان کے خوابوں، ارمانوں اور تمناؤں کی جنت تھی! جو اس قطعہ زمین پر اُتر آئی تھی۔ انھیں تو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ مچ اپنے گھر میں کھڑے ہیں۔ انھوں نے گھوم پھر کر کئی بار — بلکہ بار بار گھر کے ایک ایک گوشے کو دیکھا۔ پھر بھی جی نہیں بھرا — البتہ آنکھیں ضرور بھر آئیں۔ چھوٹا سا گھر تھا لیکن انھوں نے برسوں میں اسے ایک ایک اینٹ جما کر بنایا تھا۔ اسے بنانے کے لئے انھوں نے برسوں دن رات محنت کی تھی تب کہیں جا کر یہ گھر مکمّل ہوا تھا — گھر — ایک چھوٹی سی جنت —

جان نے پامیلا کے ہاتھ تھام کر پیار سے پوچھا۔

''گھر پسند آیا؟'' — اور جواب میں پامیلا نے اپنا سر اس کے کاندھے پر ٹکا کر اثبات میں جواب دیا۔ اس کی آواز خوشی کی زیادتی سے آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ کئی منٹ کے بعد وہ کچھ کہنے کے قابل ہو سکی — آہستہ سے کہا۔

''جان! یہ سب تمہاری محنت سے ہی تو ممکن ہو سکا۔ ورنہ ہمارا خواب شاید — خواب ہی رہتا —''

''تم نے کیا کم محنت کی ہے پام! تمہارے یہ ہاتھ'' جان نے اس کے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر محبت سے سہلایا۔ ''یہ ہاتھ کیسے گداز، کومل اور نازک تھے — چکنے ایسے جیسے مَاکھن سے بنے ہوں۔ اور اب ......'' جان نے اس کی ہتھیلیوں

کی پُشت پر اُبھری نیلی نیلی نَسوں کو چوم لیا۔

''تم نے بھی تو گیراج میں بیس، بیس گھنٹے کام کیا ہے۔ ڈارلنگ! دیکھونا۔۔۔ دن رات لوہا ٹھونکتے پیٹتے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے ہیں'' ۔۔۔ ہتھیلیاں سخت ہو کر چیخ گئی ہیں۔۔۔ رنگ، روپ، صحت سب کچھ گنوا دیا ہے تم نے''۔۔۔

پامیلا نے بڑی چاہت سے اس کی گردن میں اپنے بازو حمائل کر دیے۔

''تمہاری خوشی کے لئے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں پام! تم چاہتی تھیں نا کہ ہمارا بچّہ اپنے گھر میں پرورش پائے؟''

''ہاں۔۔۔ یہ میرا دیرینہ خواب تھا۔ جس کی تعبیر ہمارا یہ گھر ہے پامیلا نے سرشاری سے کہا۔۔۔

''کل تک وہ اکلوتا کمرہ ہی ہمارا گھر تھا۔ وہ بھی پولی کی عنایت سے ہمارا گھر بنا تھا۔۔۔ کھانا پینا۔۔۔ نہانا دھونا، سونا جاگنا سب اسی کمرے میں ہوتا تھا۔ اتنے سال تم نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ یہ سوچ کر کیسا دُکھ ہوتا تھا کہ میں نے تمہیں اس کمرے کی گھٹن کے حوالے کر کے تم سے بہت زیادتی کی ہے''۔۔۔

جان نے پشیمانی سے کہا۔۔۔

''میں تمہارے ساتھ اُس کمرہ میں بھی خوش تھی۔ کیا میں نے کبھی تم سے شکوہ کیا؟۔۔۔ نہیں نا؟ پھر تم کیوں ایسا سوچتے ہو''

''ہم خوش اس لئے تھے کہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ دُکھ میں بھی۔۔۔ اور سُکھ میں بھی ہم نے ایک دوسرے کو سہارا دیا۔ اور ہم دونوں نے اپنے خوابوں کی تکمیل میں تعاون کیا''

''زیادتی تو میں نے بھی کی۔ شادی کے اتنے برسوں میں تمہیں باپ بننے کی خوشی نہ دے سکی۔ بلکہ جان بوجھ کر تمہیں اس خوشی سے محروم رکھا۔ یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے کہ کبھی مجھے کچھ نہ کہا۔

''ڈارلنگ! میں تمہارے مقصد۔ تمہاری آرزو سے متفق تھا۔ واقعی ہمارا بچّہ اس کمرے میں کیسے پرورش پاتا۔ کیسے جیتا۔۔۔ اور سمجھدار ہو کر ہمارے بارے میں کیا سوچتا۔

ہمارے لیے ماں باپ بننا اتنا اہم مسئلہ نہیں تھا۔ وہ تو ہم کبھی بھی بن سکتے تھے۔

پامیلا— جان کا ہاتھ تھام کر کچن میں لے آئی اور اسے مونڈھے پر بٹھا کر گیس پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا۔ سائیڈ بورڈ سے ضروری برتن نکال کر چھوٹی میز پر لگائے اور چائے بنا کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ایک کپ اسے تھمایا، دوسرا خود لے لیا—

''لو یہ بسکٹ بھی لو'' میگی نے اپنی بیکری کے بہترین بسکٹوں کا تحفہ دیا ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اپنے گھر کے لئے سارا سامان ہماری بیکری سے لینا، خاص رعایت کروں گی''—

''بڑی مخلص ہے میگی اور محنتی بھی۔ شوہر کے بعد تنہا بیکری سنبھالتی ہے، جان نے بسکٹ کترتے ہوئے تعریف کی—

پامیلا نے کچن میں دو مونڈھے اور ایک نیچی سی میز ڈال کر اپنے اور جان کے کھانے پینے کا انتظام کر لیا تھا۔ عموماً صبح کا ناشتہ اور ڈنر وہ دونوں کچن ہی میں کرتے تھے۔ لنچ اتوار کے سوا ہر روز باہر ہی ہوتا تھا— ڈرائینگ روم کو پامیلا نے خوبصورت پردہ ڈال کر دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک طرف صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ دوسری طرف ڈائیننگ ٹیبل اور کرسیاں سلیقے سے رکھی تھیں۔ الماری میں کراکری سجی تھی۔ اور کارنر میں اسٹینڈ پر چھ موم بتیوں والا کرسٹل کا شمع دان رکھا تھا۔ موم بتیوں کی مدھم اور خوابناک روشنی میں مہمانوں کو ڈنر دینے کا یہ انوکھا طریقہ پامیلا کے ذہن کی اُپج تھا۔ انھوں نے گھر کی آرائش پر زیادہ پیسہ خرچ نہیں کیا تھا۔ پرانے فرنیچر کو پالش کر کے اس طرح سجایا تھا کہ نئے سے زیادہ خوبصورت لگتا تھا۔ ٹی پائیوں پر فوم کی گدّیاں لگا کر ریگزین چڑھا دیا تھا۔ صوفہ سیٹ اچھی حالت میں مل گیا تھا صرف اس کا کپڑا بدلنا پڑا تھا۔ صوفہ سیٹ کے ساتھ جو میز ملی تھی۔ اس کا شیشہ ندارد تھا۔ جان نے بڑی مہارت سے پلائی کا بیس دے کر نیا شیشہ لگا دیا تھا۔ بیڈ روم کے لئے بیڈ جان نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اور اس کا بھدّا پن چھپانے کے لئے جان نے فوم کے گدّے پر جھالر والا بیڈ کور ڈال دیا تھا۔ جو فرش کو چھو رہا تھا۔ بیڈ کے نیچے گرم کپڑوں کے بکس رکھنے کا بھی انتظام تھا— سائیڈ لیمپ رکھنے کے لئے بورڈ کے دو بیضوی ٹکڑے دیوار میں اس طرح جڑے تھے کہ بیڈ کا حصہ نظر آتے تھے— لیمپ کا ایک خوبصورت جوڑا کباڑی سے سستے

داموں پر مل گیا تھا۔ جسے پالش کر کے سجا دیا تھا۔ روز مرّہ کے کپڑوں کے لئے وارڈ روب دیوار میں ہی نکالی تھی تا کہ کمرہ کشادہ نظر آئے وارڈ روب کا قدِ آدم شیشہ ڈریسنگ کے کام آتا تھا۔ ایک گوشے میں ڈریسنگ ٹیبل پر پامیلا نے اپنا میک اپ کا سامان سجایا تھا۔۔۔ اٹیچ باتھ کی سہولت بھی تھی۔۔۔ بچے کے لئے نرسری کی تزئین میں البتہ انھوں نے کنجوسی نہیں کی تھی۔۔۔ جنگلے والی مسہری اور پالنا۔ کھلونوں کے لئے شوکیس۔۔۔ کپڑوں کی چھوٹی سی وراڈ روب اور سائڈ ٹیبل پر بچے کی ضروریات کا مختلف سامان رکھنے کے لئے انتظام تھا۔

دیواروں پر کئی ممالک کے بچوں کی خوبصورت تصاویر اور پوسٹر چسپاں تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ہلکے رنگوں کے پردے لگائے تھے۔ اور پردوں میں ننھی ننھی گھنٹیاں ٹانک دی تھیں جب ہوا کی سرسراہٹ سے پردے ہلکورے لیتے تو گھنٹیوں کی مترنّم آواز سے کمرہ گنگنا اُٹھتا تھا۔

پامیلا نے بھی گھر کو سجانے میں جان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ پردے بیڈ کور، پلو کور، ٹیبل کور، سب اس نے خود سیئے تھے۔۔۔ بچی ہوئی کترنوں اور ٹکڑوں کو کروشیا کی مدد سے جوڑ کر رنگ برنگی ٹی کوزی۔ خوبصورت پائیدان اور کھانے کی میز کے لئے میٹس وغیرہ تیار کی تھیں۔ جو دیکھنے میں بے حد اچھی لگتی تھیں یہ تو جان کو اب پتہ چلا تھا کہ پامیلا کتنی سگھڑ اور کفایت شعار ہے۔

گھر کی تعمیر کے دوران انھوں نے اپنا چھوٹا سا لان بھی تیار کر لیا تھا۔۔۔ گھاس خوب ہری اور مخملی ہو گئی تھی۔ پودوں میں رنگ برنگی موسمی پھول بھی مسکرانے لگے تھے۔ اور کیاریاں بہار دے رہی تھیں۔ گملوں میں بھی انڈور پلانٹس بڑے ہو گئے تھے۔ پودوں اور پھولوں نے گھر کی آرائش کو مکمّل کر دیا تھا۔۔۔ جان کو بچپن ہی سے پیڑ پودوں کا شوق تھا۔۔۔

جان نے برسوں پہلے پولی کے گیراج میں بطور مکینک کام شروع کیا تھا۔ اب وہ سُپر وائیزر ہو گیا تھا۔۔۔ لیکن بیشتر کام اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔۔۔ پولی بھی اسے بہت مانتا تھا۔۔۔ اور اس کی محنت کا اچھا معاوضہ دیتا تھا۔۔۔ لیکن چھٹی دینے میں سدا کا کنجوس تھا۔۔۔ حالانکہ جان اوور ٹائم کر کے سارا کام مکمّل کر دیتا تھا۔ تا کہ گاہکوں کو شکایت کا موقع نہ ملے۔۔۔ پامیلا سے

اس کی پہلی ملاقات بھی گیراج ہی میں ہوئی تھی۔۔ پامیلا ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔۔ ایک دن بچّوں کو پکنک پر لے جاتے ہوئے اسکول کی بس اس کے گیراج سے چند فرلانگ پہلے ہی خراب ہوگئی۔ بس کو دھکّا لگا کر گیراج تک لایا گیا۔۔اور جان سارا کام چھوڑ کر بس کے انجن سے اُلجھ گیا کافی دیر کی کوشش کے باوجود بس اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ پامیلا کو اس گھونچو مکینک پر بہت غصّہ آ رہا تھا جو گھنٹہ بھر سے انجن کی جان کو چمٹا ہوا تھا۔اور ابھی تک اس کی خرابی دور نہیں کر سکا تھا۔ بچّے تو سب بَس کے اندر ہی بیٹھے اُدھم مچا رہے تھے۔ٹیچرز اور ملازم بس کے باہر کھڑے۔اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔۔ پامیلا کو بہت کوفت ہو رہی تھی۔۔ ''اوہ گاڈ! آج تو پکنک کا سارا مزہ ہی کرکرا ہو گیا۔''

اس نے چڑ کر کہا۔۔ جان نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔۔ سُرخ اور سیاہ کامبینیشن کے پھولدار اسکرٹ اور سُرخ بلاؤز میں ملبوس گھنگھریالے براؤن بالوں اور براؤن آنکھوں والی گلابی۔گُلابی سی لڑکی آنکھوں کے راستے اس کے دل میں اُتر گئی۔ جان نے اسٹیرنگ سنبھالا۔سلیف دبایا تو انجن اسٹارٹ ہو گیا وہ انجن بند کر کے نیچے اتر آیا اور بے خیالی میں داہنے ہاتھ سے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا۔نظریں اب بھی اس پر مرکوز تھیں۔ پامیلا بے اختیار ہنس پڑی۔۔ جان کھسیانا ہو گیا۔۔ قریب کھڑی گاڑی کے شیشے میں اپنی صورت دیکھی تو خود بھی ہنسنے لگا۔اور رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے شرارت سے بولا۔۔

''تمہاری خاطر میں نے اتنی محنت کی اور تم میری ہنسی اڑا رہی ہو؟''۔۔

''یہ تو آپ کا کام ہی ہے۔میرے اوپر احسان تھوڑی کیا ہے''۔۔

''۔۔اور جو ایک گھنٹہ مزید تمھیں دھوپ میں کھڑا رہنا پڑتا؟''۔۔

''تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو۔۔'' وہ چڑ کر بولی۔ دوسری ٹیچرز بھی ہنسنے لگیں۔۔ انھیں بھی اس نوک جھونک میں مزہ آ رہا تھا۔۔

''انعام۔۔ مجھے انعام ملنا چاہئے۔زیادہ کچھ نہیں۔بس یہ چاکلیٹ دے دو'' جان نے ہاتھ بڑھا لیا۔۔

''لیکن یہ — یہ تو میری جھوٹی ہے۔''

اس نے جھٹ اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا —

''اس لئے تو کہہ رہا ہوں — '' جان نے شوخی سے کہا ''اب تو اس کا مزہ اور اچھا ہو گیا ہے'' —

''اوہ یونائی'' — پامیلا شرما گئی — وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ ڈرائیور پولی کو اُجرت دے کر واپس آ گیا تھا اور سب لوگ بس میں بیٹھ رہے تھے — جان نے کہا —

''جانے سے پہلے اپنا نام نہیں بتاؤ گی'' —

''پامیلا'' — اور تم؟ —

''جان — جان'' —

پامیلا جلدی سے بس میں چڑھ گئی۔ اور وہ جاتی ہوئی بس کو دیکھتا رہا۔ بس کی باڈی پر اسکول کا نام۔ پتہ اور فون نمبر لکھا تھا — اس نے فون نمبر ذہن نشین کر لیا — ''ماسٹر! — وہ چلی گئی'' — مکینک لڑکے نے ہنس کر کہا —

''کون ——؟'' جان چونک کر بولا —

''بس —— اور کون'' —— سب لڑکے ہنسنے لگے۔ وہ بھی ان کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھا۔

دوسرے دن اس نے اسکول کے نمبر پر فون کیا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ پھر بند ہو گئی۔ وہ سخت مایوس ہوا۔ ''شاید پکنک کے دوسرے دن بچّوں کو آرام کرنے کے لیے چھٹی دے دی ہو۔ ہاں یہی بات ہے۔'' اس نے خود کو بہلایا۔ اگلے دن پھر فون کیا۔ اس بار دوسری ہی گھنٹی پر فون اُٹھا لیا گیا —

''ہیلو — '' ماؤتھ پیس میں آواز اُبھری —

''ہیلو! مِس پامیلا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز اسے بلا دیں جان نے جلدی سے کہا۔ لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

''آپ کا نام'' —

''میں پامیلا کا منگیتر جان ٹرنر بول رہا ہوں''۔

''پلیز ہولڈ کریں'' شاید ہیڈ مسٹریس تھی۔ لہجہ بہت شائستہ تھا۔ کوئی ملازم ہوتا تو دس سوال کرتا۔ چند لمحوں کے بعد رسیور میں پامیلا کی آواز اُبھری۔

''ہیلو جان!'' وہ بھی ہیڈ مسٹریس کو یہی تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ کوئی ایرا غیرا نہیں ہے۔ جان خوش ہو گیا۔

''ہیلو پام ڈارلنگ شکر ہے تم نے پہچان لیا۔ کیا تم آج مجھ سے مل سکتی ہو؟''۔

''آج نہیں۔'' اس نے محتاط لہجے میں کہا۔ شاید ہیڈ مسٹریس موجود تھی۔

''کل کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' بے قراری سے پوچھا۔

''کس لئے۔؟ کیا کوئی ضروری کام ہے؟ لہجہ بیحد محتاط تھا۔

''محبت کرنے کے لئے۔ محبت سے زیادہ ضروری کام اور کیا ہو سکتا ہے؟'' وہ شریر ہو گیا۔

''کہاں؟۔ پامیلا کا محتاط رویہ اسے جلا گیا۔ کمبخت ہیڈ مسٹریس ضرور بوڑھی کھوسٹ ہو گی۔ دومنٹ کے لئے آفس سے دفع نہیں ہو سکتی کہ ہم کھل کر بات کر سکیں اس نے چڑ کر کہا۔ بے چاری پامیلا بھی کیا کر سکتی تھی۔ چپ رہی۔ ''ہم کل کہیں ڈنر کریں گے۔ کیا خیال ہے پام۔؟''۔

''جان! یہ کیا مذاق ہے۔ تم نے یہ کیوں کہا کہ میرے منگیتر ہو؟'' ''چلی گئی''۔ پامیلا کی بات سن کر جان سمجھ گیا کہ وہ اب تنہا ہے۔

''نہیں ہیں تو ہو جائیں گے۔ بس تم کل آ رہی ہو۔ ہم ڈنر کریں گے۔'' گولڈن برڈ کے بارے میں کیا خیال ہے؟۔

''ٹھیک ہے۔ آ جاؤں گی'' پامیلا نے وعدہ کر لیا۔

''پانچ بجے۔ پہلے ہم باتیں کریں گے۔ پھر.................''

''پانچ نہیں چھ بجے۔ آٹھ بجے مجھے اپنے ہاسٹل واپس جانا ہو گا'' ''اوکے ڈارلنگ''۔ جان نے رسیور کے ذریعہ بوسہ ارسال کر دیا۔ اور گنگناتا ہوا مسٹر ہارڈلی کی

کھٹارہ ویکسال پر لات مارتا ہوا پولی کے آفس میں چلا گیا۔

وہ شام بہت حسین تھی۔ پامیلا سفید فراک میں ملبوس، سنڈ ریلا جیسی خوبصورت لگ رہی تھی۔ گولڈن برڈ کے خوابناک ماحول میں وہ دونوں ایک گوشے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ٹھنڈے مشروب کے گلاس رکھے تھے۔ جان نے بڑے کھلے الفاظ میں اس سے اظہارِ محبت کیا تو پامیلا شرما گئی۔ ڈنر کے بعد دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آئے تو پامیلا اس کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے سرشار قدموں سے پارکنگ لاٹ کی سمت چل دی۔ جان اسے گرلز ہاسٹل چھوڑنے جا رہا تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ پامیلا نے اس کی شادی کی تجویز مان لی تھی۔ جو شخص پہلی ہی ملاقات میں شادی کا پیغام دے وہ یقیناً مخلص ہوگا۔ ورنہ مرد تو برسوں رومانس لڑاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی شادی نہیں کرتے۔ اور اپنے تعلقات کو دوستی کا نام دے کر کنارے لگ جاتے ہیں۔

چھ ماہ کے اندر جان اور پامیلا کی شادی ہوگئی۔ اور وہ ہاسٹل چھوڑ کر جان کے چھوٹے سے کمرے میں آگئی۔

ایک ہفتہ کے 'ہنی مون' کے بعد زندگی اسی پرانی ڈگر پر واپس آگئی جان صبح پامیلا کو اسکول چھوڑ کر گیراج واپس آجاتا۔ واپسی میں وہ بس سے گھر آجاتی تھی۔ لنچ دونوں ساتھ ہی کرتے تھے۔ شام زیادہ تر گھر ہی پر گذارتے تھے۔ البتہ اتوار کے دن جان چھٹی کرتا تھا۔ اس روز وہ ناشتہ کر کے صبح ہی صبح گھر سے نکل جاتے تھے۔ جان کی کھٹارہ بائیک اس دن آرام کرتی تھی۔ پولی کی کار پر وہ سارا دن سیر و تفریح کرتے تھے۔ لنچ اور ڈنر بھی باہر ہی کرتے تھے۔ کبھی فلم کا پروگرام بن جاتا کبھی پکنک منانے مضافاتی علاقے میں چلے جاتے تھے۔ جان اس کی ڈھیروں تصویریں اتارتا۔ زندگی کا ایک سال ہنستے مسکراتے بیت گیا۔

حسب معمول اس روز بھی وہ سارا دن باہر گزار کر اپنے کمرے میں واپس آئے تھے۔ دونوں تھکن سے بے حال تھے۔ گرم گرم کافی کا ایک کپ پی کر وہ بستر میں گھس گئے۔ جان نے اس کے بالوں کو پیار سے سہلایا۔

''پام ڈارلنگ۔ ایک بات پوچھوں؟''۔

''میری اجازت کی ضرورت کب سے پڑنے لگی ڈیئر؟''—

''بات ہی ایسی ہے''— جان ہنسا— ''یہ بتاؤ ہمارا بیٹا کب آرہا ہے۔ ہماری شادی کو پورا ایک سال بیت گیا''—

''ہُش''— پامیلا شرما گئی۔ جان اس کی شرم پر فدا ہو گیا—

''پام اب تو جی چاہتا ہے کہ کوئی ہمیں پاپا کہہ کر پکارے''

''جی تو میرا بھی چاہتا ہے جان— لیکن..........''

''لیکن کیا؟''—

''کیا ہمارا بیٹا اس چھوٹے سے کمرے میں پرورش پائے گا ڈارلنگ؟''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو پام؟''—

''یہی کہ ہمارا بچہ اس تنگ کمرے میں نہیں رہے گا''—

''کہیں تمہارا ارادہ اسے بکنگھم پیلس میں رکھنے کا تو نہیں ہے؟''

جان نے مذاق سے کہا—

''میں اتنے اونچے خواب نہیں دیکھتی۔ ہم اس کے لئے ایک چھوٹا سا گھر تو بنا ہی سکتے ہیں۔ جہاں اس کا الگ کمرہ ہو۔ اس کمرے کو ہم کھلونوں، پھولوں اور تصویروں سے سجائیں گے۔ ننھے سے پالنے میں اسے لوری سنا کر سلائیں گے— اس کے لئے واکر، پرام اور ٹرائیسکل لیں گے— اس کمرے میں تو اس کے لئے پاؤں پاؤں چلنے کی بھی جگہ نہیں ہے جان''—

''ہماری آمدنی اس خواب کی تعبیر پانے کی متحمل نہیں ہے ڈارلنگ'' ''ہم زیادہ محنت کریں گے۔ اور زیادہ بچت کریں گے— آج سے ساری تفریح، سیر سپاٹے اور ہوٹلوں کا لنچ اور ڈنر بالکل بند ہے'' ''او۔ کے''— میں پولی سے کہہ کر دوسرے ورکشاپ میں بھی کام کروں گا'' ''میں نے مسٹر شارٹی سے بات کی ہے شام کو دو گھنٹے میں ان کے ہوٹل میں کام کروں گی— تنخواہ اور ٹپ ملا کر اچھی خاصی آمدنی ہو جائے گی۔'' پامیلا نے بڑے اعتماد سے کہا—

''کام میں کروں گا تم بس گھر سنبھالو''

''تنہا تمہاری آمدنی میں تو گھر بننے میں برسوں بیت جائیں گے۔ گھر بن جائے پھر تو آرام ہی آرام ہوگا''۔

پامیلا نے سمجھایا۔

''اچھا چلو ایسا ہی سہی —'' جان بھی راضی ہو گیا۔ اور دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں سمائے مستقبل کے خاکوں میں سنہرے روپہلے رنگ بھرنے کی سعی کرتے کرتے سو گئے۔ ایک پرسکون نیند—

پامیلا صبح اسکول چلی جاتی۔ واپس آ کر لنچ تیار کرتی۔ شام کو وہ ہوٹل جاتی۔ اور جان راڈرک کے ورکشاپ میں دس گیارہ بجے رات تک کام کرتا۔ بس لنچ اور ڈنر پر ہی دونوں کی ملاقات ہوتی تھی۔ جس دن اسکول میں چھٹی ہوتی تھی اس روز پامیلا صبح بھی دو گھنٹے ہوٹل میں کام کرتی تھی۔ اور جان پولی کے گیراج سے راڈرک کے ورکشاپ تک گھن چکر بنا رہتا—

اسکول کی انتظامیہ نے بچّوں کی تعداد کے پیشِ نظر اسکول دو شفٹوں میں چلانے کا فیصلہ کیا تو پامیلا نے دوسری شفٹ کے لئے بھی اپنی خدمات پیش کر دیں— وہ بہت اچھی ٹیچر تھی— اس لئے اسکول کی انتظامیہ نے بخوشی اسے اجازت دے دی— جان نے اس کی دوہری ملازمت پر سخت اعتراض کیا لیکن پامیلا نے کسی طرح اسے منا لیا— اب صرف ڈنر پر ہی ان کی ملاقات ہوتی تھی— فرصت کے لمحات بالکل ہی عنقا ہو گئے تھے۔ سیر و تفریح خواب ہو گئی تھی— دونوں کے پاس وقت ہی نہیں تھا— گھر بنانے کی دُھن میں وہ بالکل مشین بن کر رہ گئے تھے— رات کو سونے کے لئے جب وہ بستر میں جاتے تو تھک کر چور ہو چکے ہوتے—

ان کے پاس تھوڑے سے پیسے جمع ہو گئے تو انھوں نے زمین کا ایک مناسب ٹکڑا خرید لیا۔ یہ جگہ پولی کے گیراج سے قریب ہی تھی— جیسے جیسے پیسے جمع ہوتے گئے وہ تھوڑا تھوڑا کر کے گھر بنواتے گئے۔ پورے چار سال کی محنت کے بعد ان کا گھر بن کر تیار ہو گیا۔

اتنی بڑی خوشی ان سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ انھوں نے پولی اور راڈرک کے ساتھ اپنے سارے دوستوں کو چائے پر بلایا۔ سب نے مل کر جان کو پانچ ہزار ڈالر کا چیک دیا تو وہ ان کی محبت پر نہال ہو گیا ''اتنی خطیر رقم آپ سب ہمیں کس لئے دے رہے ہیں؟'' — ''جان! یہ تمہارے آنے والے بیٹے کے لئے ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جب وہ آئے تو اسے کوئی تکلیف نہ ہو'' —

پولی نے بڑے خلوص سے کہا —

''تم سب کتنے مہربان ہو'' جان نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ اپنے گھر میں — اپنے بیڈروم میں لیٹ کر جان اور پامیلا نے بڑی طمانیت محسوس کی۔ برسوں کی تھکن غائب ہو گئی تھی۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے —

''پام ڈارلنگ۔ کل سے تم ہوٹل نہیں جاؤ گی۔ اس گھر کو اور ہمارے آنے والے بچے کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔'' جان نے اسے پیار سے حکم دیا —

''جیسی تمہاری مرضی۔ اسکول کی دونوں شفٹیں تو کر سکتی ہوں؟'' —

''بس دو چار ماہ اور کر لو — پھر چھٹی کرنا'' —

نیا مہمان کرسمس کے آس پاس آنے والا تھا — اور کرسمس میں صرف پانچ مہینے باقی تھے — اور ابھی پامیلا کو کافی تیاری کرنا تھی — ابھی تک اس نے سارا وقت اپنے گھر کو دیا تھا — اب وہ آنے والا تھا جس کے لئے یہ گھر بنایا تھا —

پامیلا اسکول سے واپس آ کر گھر کے کام نمٹاتی — پھر مشین لے کر بیٹھ جاتی — رات میں ڈنر کے بعد وہ اور جان ٹی وی کھول لیتے — یہی وقت فرصت کا ہوتا تھا — دونوں سارے دن کی روداد کہتے سنتے — پامیلا بُنائی کرتی رہتی۔ اسے اتنا کام کرتے دیکھ کر جان ٹوک دیتا —

''ڈارلنگ! تم نے اپنے لئے فضول کے کام نکال لئے ہیں — ہر چیز بازار میں ملتی ہے۔ پھر اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

پامیلا ہنس دیتی اور اسے قائل کر دیتی —

"بازار کی چیزوں میں وہ پیار کہاں جو اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے ان چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے کپڑوں میں گُندھا ہے"

پامیلا کئی دن سے مضمحل تھی۔ ہر وقت تھکی تھکی سی لگتی تھی۔ جان اس روز بہت ناراض ہوا۔۔۔

"بس اب سارا کام بند کرو۔۔۔ آج سے تم صرف آرام کرو گی" "اچھا بابا۔۔۔ یہ آخری سوئیٹر ہے اس کے بعد کچھ نہیں بناؤں گی" "پرامس!" پامیلا نے بھی وعدہ کیا۔۔۔ تقریباً ساری بنائی اور سلائی ختم ہی ہوگئی تھی۔ اس لئے وعدہ کرنے میں حرج بھی نہیں تھا۔ کرسمس سے ایک ہفتہ پہلے ان کا بیٹا آ گیا۔۔۔

گول مٹول اور سُرخ سفید بچہ بالکل جان کی صورت پر گیا تھا۔ گھنگھریالے براؤن بال اور براؤن آنکھیں پامیلا کی لی تھیں۔ جان نے اس کا نام اپنے دادا کے نام پر جارج رکھا تھا دونوں بہت خوش تھے۔۔۔ بیٹے کی آمد سے کرسمس کی خوشی دوبالا ہوگئی تھی۔ نئے گھر میں اپنے بیٹے کے ساتھ انھوں نے کرسمس منایا دوستوں کی دعوت کی تحفے لئے اور دئے گئے۔ ننھا جارج تو مالا مال ہوگیا۔۔۔ اسے اتنے تحائف ملے کہ اس کا کمرہ سامان اور کھلونوں سے بھر گیا۔۔۔

تین مہینے کی میٹرنٹی لیو کے بعد پامیلا جاب پر واپس گئی تو جارج بھی اس کے ساتھ تھا۔۔۔ اسکول کی طرف سے ننھے منے بچوں کے لئے نرسری کا بہت اچھا انتظام تھا۔۔۔ لیکن پامیلا اب ایک ہی شفٹ میں پڑھاتی تھی۔۔۔ باقی سارا وقت جارج کو دیتی تھی۔۔۔ جارج ان کے لئے بہت لکی (بھاگوان) ثابت ہوا تھا۔ جان نے گھر سے نزدیک ذاتی ورک شاپ کھول لیا تھا۔۔۔ پولی نے بھی اس کی کافی مدد کی تھی۔۔۔ مشینوں کی خریداری کے لئے سرمایہ اسی نے فراہم کیا تھا۔۔۔

جارج تین سال چھ ماہ کا ہوا تو پامیلا نے اس کا داخلہ اپنے ہی اسکول میں کرا دیا ۔۔۔ ابھی جارج فرسٹ اسٹنڈرڈ میں تھا کہ اس کا بھائی ڈینی آ گیا۔۔۔ جارج ولادت کے وقت بہت تندرست تھا، لیکن ڈینی کافی کمزور پیدا ہوا تھا۔۔۔ پامیلا اور جان کو پوری امید تھی کہ اس بار

لڑکی ہو گی لیکن ڈینی کو پا کر دونوں خوش تھے — یوں بھی بیٹا کس کو بُرا لگتا ہے — ڈینی کی دیکھ بھال کے لئے پامیلا نے خود ہی جاب چھوڑ دی — اب اسے ملازمت کی ضرورت بھی نہیں تھی — جارج کی آمدنی اچھی تھی — جیسے جیسے جارج اور ڈینی بڑے ہوتے گئے ان کے مزاج کا اندازہ ہوتا گیا۔ جارج کو کھیلوں سے دلچسپی تھی — ڈینی کا پڑھائی میں دل لگتا تھا۔ بچے بڑے ہوئے تو جان نے ان کے لئے اوپر دو کمرے بنوا دئے۔ جنہیں دونوں نے اپنے ذوق کے مطابق سجایا تھا — جارج کے کمرے میں شوخ رنگ کے پردے، قالین اور آرائشی سامان کی بہتات تھی۔ دیواروں پر مختلف ممالک کے مشہور اسپورٹس مین کے پوسٹر اور تصویریں آویزاں تھیں — الماری کھیلوں کے سامان سے اُبل رہی تھی — اس کے برعکس ڈینی کا کمرہ کتابوں سے بھرا تھا۔ شیلف۔ الماریاں، میز، کرسیاں، بستر ہر جگہ کتابیں نظر آتی تھیں دیوار وں پر مشہور مصنفین کے پورٹریٹ لگے تھے — ان دونوں کے لباس بھی ان کے مزاج کی عکاسی کرتے تھے۔ ڈینی کو ہلکے رنگوں کے کپڑے پسند تھے — جارج شوخ رنگوں کی قمیض — ٹائیاں اور ٹی شرٹس وغیرہ پہننا پسند کرتا تھا — ڈینی کتابوں کے ڈھیر میں گھسا رہتا تھا — جارج کو فُٹ بال کے میچ کھیلنے اور دیکھنے کا شوق تھا — کلب میں بھی وہ ٹیبل ٹینس کھیلتا تھا — کبھی کبھی گیراج میں بھی بیٹھ جاتا تھا۔ اپنی پارہ صفت طبیعت کے سبب وہ بہت کم عمری میں کار چلانا اور بنانا سیکھ گیا تھا —

پامیلا اور جان نے کبھی بیٹوں پر اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش نہیں کی تھی — کبھی ان کی پسند ناپسند پر تنقید نہیں کی۔ بلکہ ان کے شوق کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں ان کے ڈھنگ سے جینے میں پورا تعاون دیا — یہی سبب ہے کہ ان کے اور بچّوں کے درمیان کبھی تلخی پیدا نہیں ہوئی — یہ ایک آسودہ حال اور خوش باش خاندان تھا — اور اس کا سارا کریڈٹ پامیلا اور جان کو جاتا تھا — دونوں اپنے بیٹوں کو دیکھ کر جیتے تھے — بچّوں کو بھی ماں باپ کے خلوص اور چاہت کا احساس تھا۔ اور وہ انھیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دیتے تھے — حالانکہ پامیلا کو جارج کی تعلیم سے عدم دلچسپی کا دکھ تھا — تاہم اس نے اپنا دکھ بیٹے پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا — وہ اس کا اونچا مضبوط جسم۔ کشادہ چھاتی اور اسمارٹنس دیکھ کر ہی نہال ہو جاتی تھی —

اور ڈینی کو بھی بھائی کی طرح صحت کا خیال رکھنے کی تاکید کرتی تھی۔۔۔ میچ کا سیزن ہوتا تو جارج ہفتوں گیراج سے غائب رہتا۔ جان کبھی اس کو ملامت نہیں کرتا تھا۔ وہ واپس آتا تو اس کے میچوں کا حال پوچھتا اور جی بھر کے اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا۔۔۔

جان زیادہ محنت کر کے جلدی بوڑھا اور کمزور ہو گیا تھا۔ پامیلا بھی جوڑوں کے درد سے پریشان رہتی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب انھیں اپنے بیٹوں کے سہارے کی ضرورت تھی۔۔۔ لیکن سہارا دینے والے اپنی اپنی راہ لگ گئے۔ ڈینی کا آکسفورڈ یونیورسٹی میں معاشیات کے استاد کی جگہ پر تقرر ہو گیا۔ اور جلد ہی اس نے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ گریٹا اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ ایک بار دونوں صرف ایک دن کے لئے ماں باپ سے ملنے آئے تھے۔۔۔ اور پامیلا نے اسے اپنا سب سے قیمتی نیکلس تحفے میں دیا تھا۔۔۔ واپس جا کر برسوں انھوں نے گھر کی خبر نہیں لی۔۔۔ کہنے کو جارج ان کے ساتھ رہتا تھا۔ مگر گھر میں کم ہی نکلتا تھا۔۔۔ پھر بھی یہ کیا کم تھا کہ وہ ان کے پاس تھا۔ عمر کا وہ دور بھی جلد ہی آ گیا جب جارج کو صرف میچ دیکھنے پر اکتفا کرنی پڑی۔ فٹ بال کھیلتے ہوئے اس کے پاؤں میں جو چوٹ آئی تھی وہ اب زیادہ پریشان کرنے لگی تھی۔۔۔ مجبوراً اسے گیراج سنبھالنا پڑا۔۔۔ میچوں سے ہونے والی آمدنی بند ہو چکی تھی۔۔۔ اور اس جیسے کھلنڈرے اور شوقین آدمی کو پیسوں کی ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔۔۔ اس کے گیراج سنبھالنے پر ماں باپ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب جان چند گھنٹے گیراج میں بیٹھتا تھا۔ باقی وقت وہ اور پامیلا ایک ساتھ گزارتے تھے۔ جب ڈینی کے ہاں پہلا بیٹا ہوا تب جارج نے لزا سے شادی کی۔ لزا قصبے کی سیدھی سادی لڑکی تھی۔۔۔ اور کلب کے بار میں ملازم تھی۔۔۔ شادی کے بعد اس نے کلب کی ملازمت چھوڑ دی۔۔۔ کیونکہ یہ بات جارج کو پسند نہیں تھی کہ اس کی بیوی ایسے کلب میں ملازمت کرے جہاں وہ ٹیبل ٹینس کھیلنے جاتا تھا۔۔۔

لزا نے گھر سنبھالا تو پامیلا کو بہت آرام ملا۔۔۔ ایک طویل مدّت کے بعد جان اور پامیلا کو ایک دوسرے کی بھرپور رفاقت میسّر آئی تھی۔۔۔ ازدواجی زندگی کے ابتدائی ماہ و سال کڑی محنت اور جدّ و جہد کی نذر ہو گئے تھے۔ اور اپنا گھر بنانے کا خواب بڑے جتن سے پورا ہوا تھا۔ گھر کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تو بچّوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا زمانہ شروع ہو گیا۔

ان دنوں تو انھیں خود اپنا ہوش نہیں تھا۔ زندگی کیا انجوائے کرتے۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنے کے لئے نہ وقت تھا — نہ فرصت — دونوں اپنے بیٹوں کی فکر میں سرگرواں رہتے تھے۔ اب بیٹے خیر سے شادی شدہ تھے۔ اور خوش تھے۔ اور انہیں بھی رفاقت کے لمحات میسّر آئے تھے — اب بھی ان کی فکر و سوچ کا دائرہ دونوں بیٹوں اور ان کے بیوی بچوں کے گرد گھومتا تھا۔ وہ ان کے بچپن کی شرارتیں یاد کر کے خوش ہوتے۔ اور ماضی کی یادوں سے لطف اندوز ہوتے — انھوں نے اپنی زندگی اور وقت کا ہر پل اپنے بیٹوں کے نام کر دیا تھا — اچھے برے دنوں اور دکھ سُکھ کا ہر پل ان کے بیٹوں کی امانت تھا — ان کے بغیر وہ ادھورے تھے — حالانکہ ڈینی کبھی کرسمس پر بھی نہیں آتا تھا بس کارڈ بھیج کر بیٹا ہونے کا فرض ادا کر دیتا تھا — جارج کو تو اس تکلف کی بھی توفیق نہیں ہوتی تھی — کیونکہ سب ایک ساتھ رہتے تھے — کرسمس پر ماں باپ کو کوئی چھوٹا سا تحفہ دینے کا بھی بیٹوں کو خیال نہیں آتا تھا — پامیلا ہر موقع پر اپنا فرض نبھاتی تھی — سچ تو یہ تھا کہ سارا رشتہ، پیار و محبت یک طرفہ رہ گیا تھا — دوسری طرف کچھ نہیں تھا — نہ فرض کی ادائیگی کا خیال تھا — نہ ماں باپ کے حقوق کا پاس تھا —

ایک دن اچانک ڈینی آ گیا — وہ تنہا آیا تھا گریٹا اور بچے ساتھ نہیں آئے تھے — جان نے شکوہ بھی کیا — لیکن پامیلا ہنسی خوشی بیٹے کی خاطر مدارات میں مصروف ہو گئی۔ بچوں کو بھیجنے کے لئے کئی طرح کے کیک بنائے۔ پڑوسن مسز نیلسن کی نٹنگ مشین پر پوتی پوتا کے لئے سوئیٹر بن ڈالے۔ ڈینی چند دن رہنے کے بعد واپسی کی تیاری کرنے لگا تو پامیلا نے ممتا بھرے لہجہ میں کہا —

''اتنے برسوں بعد آئے ہو بیٹا! کم از کم ہفتہ دس روز تو ماں باپ کے پاس بھی رہتے۔''

''ماما — میں تو آپ کو ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ گریٹا اور بچے آپ کو بہت یاد کرتے ہیں —''

''لو بھلا۔ میں کہاں جاؤں گی۔ میرے جانے سے تمہارے پاپا کو تکلیف ہوگی۔''

پامیلا نے ہنس کر بات ٹالی — حالانکہ دل میں خوش بھی ہوئی کہ زندگی میں پہلی بار بیٹے کو ماں

کا دھیان آیا— ''یہاں جارج، لزا اور بچّے ہیں نا۔ پاپا کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ کیوں جارج؟—ڈینی نے بھائی کو مخاطب کیا۔

''ہاں—اور کیا؟—ماما اب ڈینی اتنے پیار سے کہہ رہا ہے تو چلی جاؤ—پاپا منع تھوڑی کریں گے''—

''ارے بھئی منع کرنے کا کیا سوال ہے۔ اچھا ہے پامیلا کچھ دن گھوم پھر آؤ۔ یکسانیت انسان کو بور کر دیتی ہے''—

جان نے بھی بیٹوں کی حمایت کی۔

''—لیکن میں بالکل بور نہیں ہوتی۔ جان کبھی میرے بغیر نہیں رہا ہے—اور میں کب اس کے بنا رہ سکتی ہوں۔''—

پامیلا کے ہر لفظ سے اپنے پیارے شوہر کے لئے محبت چھلک رہی تھی۔ ڈینی اور جارج نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس دیے۔ پامیلا شرما گئی ہائے یہ بچّے کیا سوچیں گے— بڑھاپے میں ماں باپ رومیو جیولیٹ کی طرح ایک دوسرے سے پیار کر رہے ہیں—

''ماما—جب تک آپ کا دل لگے گا رہیے گا۔ پھر چلی آیئے گا''

''بس ایک ہفتہ سے زیادہ نہ روکنا،

پامیلا نے وعدہ لیا—

''شیور۔ آپ کے اوپر کوئی زبردستی نہیں کرے گا رُکنے کے لئے''

مجبوراً پامیلا ڈینی کے ساتھ جانے کے لئے رضامند ہوگئی۔ اور اپنی پیکنگ کرنے لگی۔ جانے سے پہلے اس نے جان کے واسطے ایک چارٹ بنا کر رکھ دیا—

''یہ کیا ہے ڈارلنگ! جان نے پوچھا—

''آپ کا ٹائم ٹیبل ہے۔ کب جاگنا ہے۔ کب سونا ہے'' پامیلا نے ایک ایک بات شوہر کو سمجھائی— جان ہنسنے لگا۔

''تم مجھے آج بھی پانچ سال کا بچّہ سمجھتی ہو؟''—

''کم سے کم میں تو تمہیں بچّہ ہی سمجھتی ہوں۔ جب تک ایک بات کئی بار یاد نہ

دلاؤں تمہیں کچھ یاد نہیں رہتا ڈھیروں نصیحتیں کرنے اور ہدایتیں دینے کے بعد پامیلا ڈینی کے ساتھ چلی گئی— لیکن اس کا دل یہیں جان میں اٹکا رہ گیا— جان بھی اس کے جانے سے اداس تھا۔ لیکن وہ ڈینی سے انکار نہ کر سکا۔ بس مروّتاً ہی پامیلا کو جانے کی اجازت دی تھی۔ بار بار خیال آتا تھا کہ اس نے ٹھیک نہیں کیا۔ اور پامیلا کو خود سے دور بھیج کر اس نے ظلم کیا ہے اس پر بھی— اور خود پر بھی—

اس کی سوچ کتنی صحیح تھی اس کا اندازہ اسے چند ہی دنوں میں ہو گیا۔ تب وہ بہت پچھتایا— ہوا یہ کہ کچھ دن تو جارج اور لزا تے اس کا خیال کیا رفتہ رفتہ وہ اسے بھولتے گئے۔ دوا اور غذا میں لاپرواہی ہوئی تو کئی امراض نے جان کو دبوچ لیا— ناکافی گرم کپڑوں میں اسے ٹھنڈ لگ گئی۔ کئی کئی ہفتے اس کے کپڑے دُھلنے کے لئے پڑے رہتے لیکن لزا کو فرصت نہیں ملتی تھی— وہ سینہ پکڑے کھانستا رہتا۔ درد سے نڈھال پڑا رہتا۔ لیکن جارج بھی اس کی خبر گیری نہیں کرتا تھا۔ جارج گیراج بند کر کے آتا تو بیوی بچوں کو لے کر گھومنے نکل جاتا اور جان تنہا پڑا کڑھتا رہتا۔ اس نے کئی بار جارج سے کہا بھی کہ پامیلا کو بلا دے لیکن وہ بس ہوں ہاں کر کے ٹال گیا—

اس روز اس کی طبیعت زیادہ خراب تھی وہ اکیلا لیٹا تھا۔ اب تو اسے پامیلا پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔ کم از کم وہ اسے خط تو لکھ سکتی تھی۔ کیا ڈینی نے اس کے پاؤں میں زنجیریں پہنا دی تھیں— جو وہ واپس نہیں آ رہی تھی یا پھر اس کی طرح وہ بھی مجبور تھی یا مجبور کر دی گئی تھی۔

ہفتہ واری چھٹی کے روز جارج اپنی فیملی کے ساتھ پورے دن کے لئے باہر چلا جاتا تھا— اس دن بھی چھٹی تھی۔ اور وہ صبح ہی صبح پکنک کے لئے جا چکا تھا جارج نے اپنا مختصر سا سامان ایک بیگ میں ڈالا۔ پاس پڑے ہوئے پیسے سنبھالے— اور گھر سے باہر آ گیا۔ اس کی ٹیکسی اسٹیشن کی سمت اُڑی چلی جا رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ دیا تھا—

اس 'اولڈ ہوم' میں رہتے ہوئے جان کو کئی ہفتے ہو چکے تھے۔ اس نے 'ہوم' کی انتظامیہ کو اپنے بارے میں کچھ جھوٹی کچھ سچی کہانی سنا کر ٹھکانہ حاصل کر لیا تھا—— دراصل اس نے یہاں آنے کا فیصلہ اپنی خوشی سے نہیں کیا تھا— لزا نے جارج کو الٹی میٹم دے دیا تھا

کہ اگر جلد ہی پاپا کا کوئی انتظام نہیں ہوا تو وہ بچوں کو لے کر اپنی ماں کے پاس چلی جائے گی۔ یہاں رہ کر اسے بچوں کو ٹی۔بی نہیں کرانا ہے۔ پاپا چوبیس گھنٹے کھانس کھانس کر سارے گھر کو جراثیم آلود کر رہے ہیں اور جارج نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد پاپا کے لئے گیراج کے عقب میں بنا ہوا سامان کا اسٹور خالی کرا دے گا۔ اور انھیں وہاں شفٹ کر دے گا۔

لزا کی بات کا جان نے بُرا نہیں مانا تھا۔۔۔ لیکن جارج کی باتیں تیر کی مانند اس کے کلیجے میں ترازو ہو گئی تھیں۔۔۔ جارج اس کا اپنا بیٹا تھا۔۔۔ لزا تو غیر تھی۔۔۔ اس کا جنت جیسا گھر جسے پامیلا نے اور اس نے کڑی محنت اور جدّ و جہد کے بعد بنایا تھا۔۔۔ جس کا ہر گوشہ ان کے لمس سے آشنا تھا۔۔۔ جس کی ہر شے ان کے خون پسینے سے بنی تھی۔۔۔ اب پرایا ہو چکا تھا۔۔۔ زندگی کا سفر جس مقام سے شروع ہوا تھا اس کا اختتام بھی اسی جگہ ہونے والا تھا۔۔۔ اور یہ بات جان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔۔۔ یہی سبب تھا کہ اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اپنے پیچھے اپنا کوئی نشان تک نہیں چھوڑا تھا۔۔۔ اس گھر میں بھی کسی کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔۔۔

اس صبح 'ہوم' کے لان میں ہوا خوری کرتے ہوئے اس کی نظر دوسرے لان کی سمت اٹھ گئی۔۔۔ 'ہوم' کے خواتین والے حصّے میں بیمار اور بوڑھی، تنہا اور بے سہارا عورتیں صبح کی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔۔۔ اسے کچھ شبہ سا ہوا۔۔۔ اور وہ اپنے ساتھی مسٹر ڈینیل کو چھوڑ کر۔۔۔ تیز تیز قدموں سے اس لان کی طرف بڑھ گیا۔ اور وھیل چیئر پر بیٹھی ہوئی خاتون کے سامنے پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔۔۔

''پام!'' اس نے پکارا۔۔۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔۔۔ پہلے ان کے لبوں پر مسکراہٹیں پھیلیں۔۔۔ پھر آنکھوں کے کٹورے چھلک اٹھے۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ اس کی پام ہی تھی۔۔۔

''تم بھی؟'' ''پام تم بھی۔۔۔؟''۔۔۔

اگلے پل دونوں ایک دوسرے سے لپٹے بے تحاشہ رو رہے تھے۔

☆☆

کہاں ہو تم!

''امّی — امّی'' —''

وہی مانوس آواز — ویسا ہی شہد آگیں لہجہ۔ شاید یہ اس کی سماعت کا قصور تھا — آواز کون دیتا۔ وہ تو خاموش تھا۔ لیکن اس کی خاموشی اسے آواز دے رہی تھی۔

اس کے سامنے اس کا جوان، وجیہہ اور خوبرو بیٹا محوِ خواب تھا۔ وہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں نہار رہی تھی —— اور دل ہی دل میں اس پر صدقے واری ہو رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مدّتوں کے بعد اسے دیکھ رہی ہے۔ اس نے برسوں سے اسے نظر بھر کے نہیں دیکھا تھا۔ مبادا اس کی نظر نہ لگ جائے۔ کہتے ہیں کہ چاہنے والوں کی نظر بڑی جلدی لگتی ہے اور ایک ماں سے زیادہ اپنے بچّے کو اور کون چاہ سکتا ہے۔

اس وقت وہ گہری اور پُرسکون نیند میں ڈوبا اس کے سامنے تھا۔ اسے وہ دن یاد آرہا تھا جب اس نے پہلی بار اس کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار اسے تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ حالانکہ اس کا ننھا سا کمزور وجود اس وقت خود ہی سہارے کا محتاج تھا۔ ایک ننھا سا پودا، جسے پروان چڑھا کر، پال پوس کر تناور اور چھتنار درخت کی تشکیل کرنا تھی۔ تخلیق کے مرحلے سے گذرنے کے بعد ہر ماں کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ اس سایہ دار پیڑ کی چھاؤں میں سکون کی چند سانسیں لے سکے۔ اسے خود غرضی تو نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ ایک ماں، بلکہ ہر ماں کا خواب ہوتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ عورت اپنے شریکِ سفر سے محبت تو کرتی ہے، اس کی سلامتی کی دعائیں بھی مانگتی ہے، لیکن اسے اپنے بڑھاپے کا سہارا نہیں

سمجھتی ،اور جس ننھی سی جان کو اپنے ہاتھوں سے پال پوس کر بڑا کرتی ہے اس کو مضبوط سہارا بھی سمجھتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ اس کے اپنے وجود کا حصّہ ہوتا ہے۔ اپنا خون ہوتا ہے۔

وہ دن! جب پہلی بار اس نے گود سے اُتر کر زمین پر پہلا قدم رکھا تھا—— وہ پل جب اسے پہلی بار ماں کہہ کر پکارا تھا—— وہ لمحہ جب عملی زندگی میں اس نے پہلی بار بڑے اعتماد سے پاؤں رکھا تھا۔ یہ اور ایسے کتنے لمحے تھے جو ایک خوبصورت یادگار کی مانند اس کے دل میں محفوظ تھے— اور اس نے انھیں ایک قیمتی امانت کی طرح اپنے دل میں اپنی یادوں میں چھپا رکھا تھا— گاہے گاہے وہ اپنی یادوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاتی اور بیتے ہوئے خوش گوار لمحوں کو اپنی مٹھی میں بند کر لیتی۔ وہ انھیں کسی اور کے ساتھ شیئر کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ یہی تو اس کا ذاتی اثاثہ تھا—

وہ زمانہ جب دقیانوسی خاندان کی کہنہ روایتوں سے انحراف کرنا بھی باغیانہ اقوام میں شمار ہوتا تھا ایسا ماحول جہاں ساری پابندیاں عورتوں کے لیے تھیں اور مردوں کو عیاشی کی کھلی چھوٹ تھی۔ ناز و نعم میں پلنے والا ہر بچّہ جی بھر کے بگڑنے کے لیے آزاد تھا اور وہ ایک مختلف ماحول کی پروردہ تھی۔ جہاں تعلیم کا چلن عام تھا۔ سو اس نے بھی اپنے بیٹے کے لیے وہی کچھ پسند کیا اور اس کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی۔ وہ اسے نکما، ناکارہ، جاہل اور عیاش رئیس زادہ بنانے کے بجائے قلم سے روزی پیدا کرنے والا عام انسان بنانا زیادہ اچھا سمجھتی تھی— اس کی خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور وہ فخر سے کہہ سکے کہ یہ اس کا بیٹا ہے۔ اس کے خوابوں کی تعبیر ہے—

وہ چاہتا تو ڈاکٹر۔ انجینئر یا آفیسر بن سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے لئے جرنلزم کا انتخاب کیا۔ اس نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ شوخ اور چنچل آبِ رواں کو کسی مخصوص راستے کا پابند بنانا ناممکن ہوتا ہے۔ اس نے بھی اپنی راہ خود تلاش کی اور ایک چاہنے والی ماں کی طرح اس نے بھی بیٹے سے پورا تعاون کیا۔ کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ بیٹے میں ماں کا اثر آیا ہے۔ گویا پڑھنا اور لکھنا بھی کوئی خوفناک متعدی مرض تھا جو اس نے ورثے میں اپنے بیٹے کو منتقل کر دیا تھا۔ اگر باپ زندہ ہوتا تو وہ بھی اس کے نکمے پن پر بہت رنج کرتا۔ کیونکہ اسے تو

بیوی کے ہاتھ میں بھی قلم دیکھ کر سخت شکایت ہوتی تھی اور وہ اسے اکثر و بیشتر فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کا طعنہ دیتا تھا — اور شوق کی ماری اسے صبر و شکر سے برداشت کرتی تھی۔ اُسے تو خوشی تھی کہ بیٹا تخلیقی کارنامے انجام دے گا وہ اس کے شوقِ مطالعہ سے خوب واقف تھی بہت کم عمری ہی میں اس نے انگریزی اور ہندی کے ہر بڑے مصنف کو پڑھا تھا — اور اسی شوق نے اس کے ہاتھ میں قلم تھمایا تھا — جب اس کے آرٹیکل — کہانیاں اور فیچر شائع ہونے لگے تو اس کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی انھیں لوگوں نے کیا جو اس کے بدترین مخالف تھے — ایک نیوز پیپر سے دوسرے نیوز پیپر — اور ایک میگزین سے دوسرے میگزین تک اس کا سفر جاری تھا۔ اور دن بہ دن اس کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ خوش تھی — بہت خوش تھی۔ جب کسی محفل میں کوئی جانی انجانی ہستی بڑھ کر اسے مبارک باد دیتی اور اس کے بیٹے کی تعریف کرتی تو وہ مغرور ہو جاتی — کسی نامور اخبار کا مخصوص کالم۔ کسی معیاری میگزین کا آخری صفحہ اس کے قلم سے مزیّن ہوتا اور اس کی تحریر کی جادوگری پرچے کی اشاعت میں اضافہ کا سبب بن جاتی — وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتا — اس سے پورا انصاف کرتا اس کے لئے اسے بار بار سفر کرنا پڑتا — لائبریری میں بیٹھ کر گھنٹوں کتابیں کھنگالنا پڑتیں۔ رسائل کا مطالعہ کرنا پڑتا۔ اور اہم شخصیتوں سے انٹرویو بھی کرنا پڑتا۔ تب کہیں جا کر وہ مطمئن ہوتا۔ گہرا مشاہدہ، عمیق مطالعہ اور ذاتی تجربات اس کی گوناگوں کامیابیوں میں اہم کردار ادا کرتے تھے —

جیسے جیسے اس کی شہرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی حساب سے اس کے حاسدوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ سب اس کے مزاج پر بے حد گراں ہوتا تھا۔ وہ اکثر اس سے سوال کرتا کہ ابھی تو میں نے ایسا کوئی خاص کارنامہ بھی انجام نہیں دیا ہے۔ پھر یہ حسد کیوں؟ جب کہ مجھ سے کہیں زیادہ بہتر لکھنے والے موجود ہیں؟۔ وہ اسے تسلّی دیتی کہ ایسا تو سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ تمہارے ساتھ کچھ نیا تو ہو نہیں رہا ہے — وہ وقتی طور پر بہل جاتا، لیکن اس کے اندر شیشے کی یہ ننھی سی کرچ چبھتی رہتی۔ کبھی کبھی یہ چبھن اتنی بڑھ جاتی کہ وہ پریشان ہو جاتا۔ اور تنہائیوں میں پناہ لیتا۔ یہ وقفہ کبھی چند دن کا ہوتا۔ اور کبھی ہفتوں پر محیط ہو جاتا۔

اس کی حساس طبیعت ہر دم اسے بے چین رکھتی تھی۔ دنیا والے جس قدر بے حس اور بے درد تھے وہ اس سے کہیں زیادہ حساس تھا—— کاش وہ بے حس ہوتا—

اچانک اس کا دل اپنی ملازمت سے اُچاٹ ہو گیا۔ اور اس نے اخبار اور میگزین کو خیر باد کہہ کر ایک اشتہاری کمپنی میں بطور کاپی رائیٹر شمولیت اختیار کر لی۔ ماحول کی تبدیلی نے اس پر بڑا خوش گوار اثر ڈالا تھا اور وہ اپنے کام سے بہت خوش تھا— وہاں اس کی پذیرائی بھی خوب ہوئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے لکھے ہوئے جنگلز — اور اشتہار بے حد مقبول ہو گئے۔ ٹی وی— ریڈیو، میگزین، اخبار ہر جگہ ہر وقت اس کا کوئی نہ کوئی اشتہار سننے اور دیکھنے میں آتا۔ چار لائنوں کا جنگلز— اور دو جملوں کے اشتہار سے اس کے اندر کا تخلیق کار کیا خاک آسودہ ہوتا۔ اس لئے وہ اخباروں اور جریدوں میں کالم، آرٹیکل اور کہانیاں بھی لکھتا رہتا— ساتھ ہی اس کی مخالفت میں اٹھنے والی آوازوں کا شور بھی بڑھتا گیا۔ کہیں اس کے نام سے کالم دینے پر اعتراض ہوتا— کہیں بلا وجہ اس کی لکھی ہوئی ہیڈ لائنس کاٹ دی جاتیں— اور کبھی اس کی ذاتی کاوش کو 'ٹیم ورک' کہہ کر ہلکا کرنے کی کوشش کی جاتی— نتیجہ وہی ہوا جو اس سے پہلے ہوتا رہا تھا— اس نے یہ ملازمت بھی چھوڑ دی— اور فری لانسنگ کی دوڑ بھاگ شروع ہو گئی۔ اور پھر یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا— کبھی ملازمت کی۔ کبھی آزادانہ لکھنے لکھانے کی روش اپنائی۔ اس کا کرب اور بے قراری بڑھتی رہی— اسے بیک وقت کئی محاذوں پر جنگ کرنا پڑ رہی تھی— اس کے اندر کا تخلیق کار شکست ماننے کے لئے تیار نہیں تھا— کبھی وہ تھک کر چور ہو جاتا، اور کبھی نئے عزم و حوصلے سے اٹھ کھڑا ہوتا۔ دراصل وہ اپنے اصولوں کے خلاف سمجھوتا کرنے سے قاصر تھا— اور نہ ہی اپنے قلم سے بد دیانتی کرنے پر تیار تھا— مصلحتوں اور سمجھوتوں کے اس دور میں اس کی حق گوئی اور بیباکی اس کے لیے قدم قدم پر رکاوٹ بن رہی تھی— اس نے بار ہا خود سے اعتراف کیا کہ وہ اس دنیا کے لئے 'مس فِٹ' ہے۔ کاش اس نے بھی عام انسان کی طرح عام سی زندگی جی ہوتی تو وہ اتنا دل برداشتہ نہ ہوتا۔ وہ خود بھی اس سچائی سے واقف تھی کہ اس کے لئے اپنے آپ کو بدلنا ممکن نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ زمانہ کے ساتھ چل سکتا ہے۔ حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ وہ خود کو اس حد

تک بدل لے کہ اس کے لئے جینا آسان ہو جائے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب وہ پاؤں پاؤں چلنے والا ناسمجھ بچہ نہیں ہے۔ جسے انگلی تھام کر چلنا سکھائے۔ وہ ذہین اور حساس نوجوان تھا۔ اس کے اپنے کچھ اصول تھے۔ اپنی سوچ تھی اور زندگی کو برتنے کا اپنا ایک رویّہ تھا۔ ایسے میں وہ خود کو بہت بے بس پاتی تھی ــــ زندگی کی دوڑ میں وہ اس سے بہت آگے جا چکا تھا اور وہ کہیں پیچھے چھوٹ گئی تھی ــــ قریہ قریہ بھٹکنے کے بعد وہ بیرونِ ملک بھی گیا ــــ لیکن واپس آیا تو بدستور ناآسودہ تھا ــــ ان دنوں وہ سخت ذہنی بُحران سے گزر رہا تھا ــــ اس کے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ اور شکست وریخت بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھی ــــ لوگوں کی رائے تو یہ تھی کہ اس نے ایک گولڈن چانس مِس کر دیا ہے۔ اور معاہدہ کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی۔ لاکھوں کا نقصان برداشت کر کے واپس آ گیا ــــ افسوس تو اسے بھی ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کے کرب سے آشنا تھی۔ اس لیے خاموش تھی ــــ جس اخبار میں اسے ایک ذمہ دار پوسٹ، دلکش تنخواہ، جملہ سہولیات اور آسائش دے کر بلایا گیا تھا اس کا چیف ایڈیٹر انگریز تھا اور اس کی حاکمانہ فطرت ایشیائیوں کو اپنا محکوم بنا کر خوش ہوتی تھی۔ وہ انہیں ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ وہ یہ بات کیسے بھول سکتا تھا کہ اس کی قوم نے سیکڑوں سال ان پر حکومت کی ہے۔ وہ لاکھ آزاد ملک کے شہری ہوں لیکن یہاں ایک اونچی کرسی پر بیٹھ کر اسے ان پر حکومت کرنے کا موقع مل رہا تھا تو وہ بھی کیوں انھیں برابری کا درجہ دے۔ وہ کل بھی ان کا آقا تھا اور آج بھی ان کا حاکم ہے۔ اسے تو اپنے ہم وطنوں پر بھی غصہ آتا تھا جو ذہنی طور پر اب بھی گوری چمڑی والوں کو اپنا آقا سمجھتے تھے۔ اور خود کو ان سے کمتر مانتے تھے۔ حالانکہ انگریز ایڈیٹر کا رویّہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ اور وہ اس کی قابلیت کا معترف تھا۔ لیکن وہ اپنے بھائی بندوں کی تذلیل کیسے برداشت کرتا۔؟ دیارِ غیر میں وہ انہیں کچھ زیادہ ہی اپنا سمجھتا تھا۔ اور ان کے مفادات اور عزّتِ نفس کی حفاظت کرنا اپنا فرض جانتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنے گرد و پیش سے بے خبر رہتا اور صرف اپنے مفاد کی فکر کرتا۔ لیکن وہ ان عام لوگوں کے زمرے میں کب تھا۔ 'وہ' تو بس 'وہ' تھا۔ اس نے اپنی قوت بھر اپنے ہم وطنوں کے حقوق کی حفاظت کی۔ اور ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ کسی

حد تک اسے کامیابی بھی ملی۔ لیکن اس کا دل اُچاٹ ہو گیا— اور وہ اپنے نقصان کی پرواہ کیسے بغیر واپس آ گیا۔ زندگی میں اس نے پہلے بھی کبھی نفع نقصان کا حساب نہیں کیا تھا۔ بلکہ دیکھا جائے تو گھاٹے کا سودا زیادہ کیا تھا— یہ سچ ہے کہ پیسہ کمانا اس کا مقصد کبھی نہیں رہا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ پیسہ خود اس کے قدموں سے لپٹا اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کا یقین اور اعتماد اور اپنے قلم کی طاقت پر بھروسہ ہی اس کی اصل دولت تھا۔ اور اس کا پاک وصاف ضمیر، پستی کے قصر و مذلت سے اسے کوسوں دور رکھتا تھا۔ لالچ، رشوت، عہدہ اور دولت اسے خریدنے میں ہمیشہ ناکام رہی۔ اس نے کسی موقع پر بکنا گوارہ نہیں کیا۔ اور نہ ہی کسی بڑی قوت کے سامنے جھکنا پسند کیا۔ شاید یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی— ہوا کے رُخ کے خلاف چلنے والے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔ اس نے بھی ہر طرح کا خسارہ برداشت کیا اور ہوا کے رُخ کے خلاف سفر جاری رکھا۔ اسے منزل پر پہنچنے کی نہ تو جلدی تھی— اور نہ فکر۔

ایک طرف وہ طاقتیں تھیں جو اس کی شخصیت کو مسخ کرنے کے در پے تھیں۔ اور اس کی شناخت کی نفی کرنا جن کا مشن تھا— دوسری طرف وہ تھا— اپنی ذات میں بالکل تنہا۔ بالکل اکیلا— وہ خود کو ان بدنما سانچوں میں ڈھالنے کے لئے تیار نہیں تھا جو فی زمانہ پسندیدہ سمجھے جاتے تھے۔ اسے خوشبو، روشنی اور قدرتی مناظر سے پیار تھا۔ تہذیب اور شائستگی اس کی فطرت میں رچی بسی تھی۔ آرٹ، ادب اور موسیقی کے بغیر وہ زندگی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا—

اس بار وہ لوٹ کر آیا تو ہمیشہ سے زیادہ پُرسکون تھا۔ اس کے لبوں کے گوشہ میں چھپی ہوئی مسکراہٹ اور چہرہ پر پھیلی ہوئی طمانیت کی مدھم، مدھم روشنی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ وہ ہار کر نہیں جیت کر آیا ہے۔ اس نے ان ساری طاقتوں کو شکست دے دی تھی جو اسے مٹانے اور ختم کرنے کے در پے تھے—

اس نے بڑے فخر و غرور سے اسے دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔ اس دھند کے پَسِ منظر میں وہ کہیں نہیں تھا۔ بس اس کی آواز کی بازگشت تھی۔ اور وہ یادوں کی پٹاری کھولے تنہا بیٹھی تھی۔ سینکڑوں ہزاروں لوگوں کے ہجوم میں بھی وہ بالکل اکیلی تھی—

☆☆

عورت

اچانک ایک ننھی سی چیخ سن کر شاہ رخ بدحواس ہو گیا۔ اگلے ہی پل اُس کا ننھا منا وجود اس کی مضبوط بانہوں کے حصار میں تھا۔ وہ اس کی کشادہ چھاتی سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی گرفت بھی ایسی تھی جیسے کسی معصوم بچے نے ربڑ کی گڑیا کو تھام رکھا ہو۔ وہ تھی بھی تو گڑیا جیسی۔ تب ہی تو گھر میں سب لوگ اسے گڑیا، مُنّی، بٹو اور بٹو کہہ کہ پکارتے تھے۔ اور اسے بھی اپنے یہ پیار کے نام بہت اچھے لگتے تھے جہاں کسی نے اسے پیار سے آواز دی۔ ــــــ اور وہ دوڑ گئی۔ ظاہر ہے یہ سارا پیار محض کسی کام کے لئے ہوتا تھا۔ لیکن اسے لوگوں کی خودغرضی سے کوئی غرض نہیں تھی ــــ وہ تو پیار کی بھوکی تھی ــــ جو اسے بے حد وحساب مل رہا تھا ــــ لیکن اس وقت نہ جانے کیسا معجزہ ہو گیا تھا کہ اٹھارہ برس کا طویل سفر لمحوں میں طے ہو گیا تھا۔ اور وہ اپنے دھک دھک کرتے دل کو بے قابو ہونے سے نہ روک سکی۔ شاید یہ شاہ رخ کے لطیف لمس اور آہنی گرفت کا کمال تھا کہ رگوں میں خون کے بجائے گرم گرم سیال دوڑنے لگا۔ اور ٹھنڈا اٹھار پڑا ہوا جذبات کا آتش فشاں کچھ اس قیامت سے جاگا کہ کھولتا ہوا لاوا اس کے وجود کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ اب وہ ننھی منّی سی گڑیا نہیں، اٹھارہ سال کی بھرپور جوان لڑکی تھی جس کا نام کہکشاں تھا۔ صرف کہکشاں ــــ جس کے روم روم میں بجلیاں بھر گئی تھیں اور دل میں جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کا دل مچل رہا تھا کہ اس طوفان میں پوری طرح ڈوب جائے۔ ایسے ڈوبے کہ پھر کبھی نہ اُبھرے ــــ کہ زندگی محض بچ جانے کا ہی نام نہیں ہے۔ کبھی کبھی زندگی ڈوب کر بھی ملتی ہے ــــ فنا کا دوسرا نام زندگی ہے۔

اس کی پیدائش بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ شہر کی جانی مانی گائینا کالوجسٹ کا فیصلہ تھا کہ صولت بیگم کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔ دوا علاج کے علاوہ گنڈے تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے بھی کیے گئے۔ نہ جانے کتنی درگاہوں پر جا کر منّت مانی گئی لیکن وہ ماں نہ بن سکیں۔ ان کی شادی کو آٹھ سال گزر گئے تھے۔ بڑے مکان میں ہر طرف بچوں کی ریل پیل تھی۔ لیکن ان کی گود ہنوز سونی تھی۔ وہ تو اللہ کی رحمت سے بالکل ہی مایوس ہو گئی تھیں کہ اچانک ناامیدی کی بدلیاں چھٹ گئیں۔ اور امیدوں کا چاند جگمگا اٹھا۔ نہ جانے کس گھڑی اور کس ساعت میں ان کی دعاؤں کو قبولیت مل گئی تھی—

وہ صولت بیگم کی آغوش میں ایک حسین پری کی مانند محوِ خواب تھی۔ اس کی بند پلکوں تلے ستاروں کی کہکشاں جگمگا رہی تھی۔ شاید اسی لئے بڑی چچی نے اسے کہکشاں کے نام سے پکارا تھا۔ صولت بیگم تو نہال ہو گئیں بڑے مکان میں تو ویسے بھی بڑی چچی کا ہی راج تھا۔ اور دونوں دیورانیاں ساس کے بعد انھیں کا حکم مانتی تھیں۔ ساس کے گذرنے کے بعد وہ اب اس خاندان کی قابلِ تعظیم ہستی تھیں۔ صولت بیگم کی چھٹی کا نہان بڑی دھوم دھام سے ہوا— ساری رسمیں بڑی چچی نے بہت مان گون سے ادا کیں۔ اور ننھی پری کو اپنی گود میں لے کر بڑے حق اور مان سے کہا

"منجھلی دلہن! آج سے گڑیا ہماری ہوئی۔ یہ میرے شاہ رُخ کی دلہن بنے گی۔ تمہیں کوئی اعتراض ہو تو ابھی بتا دو" لہجہ میں بھرپور اعتماد تھا۔

"بڑی بھابھی! اعتراض بھلا کیوں ہوگا۔ یہ تو ہے ہی آپ کی۔" صولت مسکرائیں اور قریب بیٹھے ہوئے شاہ رُخ کو اپنے پہلو سے لگا لیا۔ وہ بڑی حیرت اور دلچسپی سے اس پیاری پیاری گڑیا کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کی گلابی گلابی انگلیاں چھوتا۔ کبھی اس کے بسورنے پر خوش ہو کر ہنسنے لگتا— بڑی چچی کو بیٹے کی اداؤں پر پیار آ گیا۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے بعد ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ لیکن اسے پانے کی خوشی ایسی تھی کہ انہیں دوسری اولاد کی خواہش ہی نہیں ہوئی۔ اب گڑیا کو دیکھ کر انہیں پہلی بار بیٹی کی کمی کا احساس ہوا— اور انھوں نے جھٹ اسے اپنے شاہ رخ کے لئے مانگ لیا۔ بہو بھی تو بیٹی ہی ہوتی ہے۔

''منجھلی دلہن! میں خالی خولی وعدوں سے بہلنے والی نہیں ہوں۔ اللہ نے اتنے انتظار کے بعد اسے تمہاری گود میں میرے شاہ رخ کے لئے بھیجا ہے۔ بولو کیا کہتی ہو؟''

''چلئے گڑیا آج سے — بلکہ ابھی سے آپ کی ہوئی۔ اور شاہ رخ میرا بیٹا بن گیا۔'' صولت نے ہنس کر کہا —

بڑی چچی نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر اس کی ننھی منی دو انگلیوں میں پھنسا دی۔ اور اپنے سُرخ دوپٹے میں اسے لپیٹ لیا۔ چند نوٹ اس کے سر سے وار کر نائین اور دائی ماں کو دیے — اور شگن کے روپے منجھلی دلہن کے حوالہ کیے — صولت نے بھی اپنی انگوٹھی شاہ رخ کی اُنگلی میں پہنا دی۔ اس کا صدقہ دیا اور شگن کے روپے، جٹھانی کے حوالہ کیے۔ ذرا سی دیر میں بڑے مکان میں منگنی کی چہل پہل نے ایک تقریب کا سماں باندھ دیا۔ سب کا منہ میٹھا کرایا گیا اور دوسرے دن دعوت کا اہتمام کیا گیا —

صولت بہت خوش تھیں۔ اوّل تو یہ کہ ان کی منّتوں مرادوں والی بیٹی ہمیشہ نظروں کے سامنے رہے گی پھر یہ بھی تھا کہ گھر کی سب سے بڑی بہو نے اسے اپنے بیٹے کے لیے مانگ کر ان کا رُتبہ خاندان میں بڑھا دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ان کی گڑیا راج کرے گی۔ بڑے مکان میں تو خوشیوں کی بارات اُتر آئی تھی — شاہ رُخ اس وقت سات سال کا تھا — کیونکہ اس کی ولادت بھی کچھ تاخیر سے ہوئی تھی۔ یوں ان دونوں کا جوڑ بھی بڑا مناسب تھا۔ اور جب بات خاندان کی خوشیوں کی ہو تو مناسب اور نا مناسب کون دیکھتا ہے۔ جبکہ یہاں تو سب کچھ اچھا ہی اچھا تھا —

بڑی چچی نے اس رشتے کو نبھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وہ ہر تہوار پر کہکشاں کے لئے تہواری ضرور بھیجتی تھیں — قیمتی فراکیں، چھوٹے چھوٹے سونے اور چاندی کے زیورات، چوڑیاں — ہار پھول، عطر، مٹھائی اور عیدی کے نقد روپۓ الگ سے — محرّم کی چھ تاریخ کو وہ اسے منّت پہناتیں — صولت بھی شاہ رُخ کا اس طرح مان گون کرتیں۔ بڑی دلہن جو خاندان کی سب سے زیادہ متکبر اور رتنک مزاج خاتون تھیں۔ جب اس طرح ننھی کہکشاں کی اللہ آمین کرتیں تو صولت کو اطمینان ہو جاتا کہ جو چچی ابھی ان کی بیٹی پر ایسا

صورتے واری ہو رہی ہے وہ ساس بن کر بھی اسے پلکوں پر بٹھائے گی اور پھولوں پر چلائے گی۔

آٹھ نو سال تک تو کہکشاں کا قد عام بچّوں کی مانند بڑھتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی بڑھوتری رک سی گئی۔ سال پر سال گزرتے گئے۔ لیکن اس کا قد وہیں کا وہیں رہا۔ صولت نے دوا علاج کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ انجکشن۔ ٹانک دوائیں۔ ورزشیں سب لاحاصل ثابت ہوئیں۔ ماں باپ کو تشویش ضرور تھی لیکن ان کی محبت میں کمی نہیں آئی تھی۔ چھوٹے سے قد کی بے انتہا حسین گڑیا جیسی بیٹی انہیں بے حد عزیز تھی — اسے دیکھ کر تو غیروں کو بھی پیار آتا تھا۔ اسکول کی ٹیچرز اور لڑکیاں بھی اسے بے حد پیار کرتی تھیں — وہ تھی بھی بے حد ذہین۔ ہمیشہ ہر کلاس میں فرسٹ آتی تھیں۔ اور سب سے خوبصورت بچّی کا تاج ہر سال اس کے سر پر سجایا جاتا تھا — ڈراموں میں اسے راج کماری یا ننھی پری کا رول دیا جاتا تھا۔ دکھ تو اسے اس وقت ہوتا تھا۔ جب اس کے ساتھ کی لڑکیاں ہیروئن کا کردار ادا کرتیں اور ایسے موقع پر اسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ لیکن وہ ان کی مجبوری سمجھ سکتی تھی۔ اس لیے صبر کر لیتی

یوں تو گھر میں اس سے سب ہی پیار کرتے تھے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی پیار کا اظہار کرتے تھے لیکن بڑی چچی کا رویہ بدل گیا تھا۔ اب وہ اس کے لئے عید بقرعید پر تہواری کی کشتیاں نہیں سجاتی تھیں۔ بلکہ اور بچوں کی طرح اس کے ہاتھ پر بھی عیدی کے چند روپے رکھ دیتی تھیں۔ اور کسی نے یہ فرق محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ صولت نے البتہ بہت محسوس کیا۔ لیکن زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ رفتہ رفتہ منگنی کا واقعہ بھی سب لوگ بھول بھال گئے۔ جیسے یہ بھی گڑیا گڈے کی شادی کی طرح صرف ایک تفریح ہو۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ جب تک رشتوں کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ سب لوگ اسے یاد رکھتے ہیں۔ ورنہ اتنی فرصت کس کو ہے کہ پُرانے قصّوں کو یاد رکھے۔ اور تو اور — خود کہکشاں کو بھی کچھ یاد نہیں تھا۔ نہ ماں نے کبھی اس سے ذکر کیا نہ خاندان والوں نے شاہ رخ کا نام لے کر اسے چھیڑا۔ اور چھیڑ کر بھی کیا کرتے۔ بڑی چچی کا رویہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ وہ تو اپنی جگہ یہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ اپنے وجیہہ اور دراز قد بیٹے کی شادی کسی اچھی سی لڑکی سے کریں گی۔ کہاں چھ فٹ اور دو انچ کا ان کا اسمارٹ

بیٹا شاہ رخ ـــــ اور کہاں پونے چار فٹ کی یہ بونی ـــ اب وہ اتنی بھولی بھی نہیں تھیں کہ برسوں پہلے کی حماقت کو یاد رکھتیں۔ دنیا میں ان کے بیٹے کے جوڑ کی لڑکیوں کی کمی تو نہیں تھی۔ وہ تو اب اس بات کا ذکر تک سننا گوارا نہیں کرتی تھیں ـــ اس لئے شاہ رخ بھی بچپن کی منگنی سے لاعلم رہا۔ اسے معلوم بھی ہوتا تو وہی کرتا جو ماں کر رہی تھیں۔ آخر اس کے اپنے بھی تو کچھ ارمان تھے ـــ

بڑے مکان کے سارے بچے جیسے ایکا کر کے جوان ہو گئے۔ کئی لڑکیاں بیاہ کر پیا کے دیس سدھار گئیں۔ اور باہر کی لڑکیاں دلہن بن کر بڑے مکان کی دہلیز پر اُتریں۔ بقول اچھی امّی کے ''یقین'' نہیں آتا تھا کہ ابھی کل تک یہی لڑکیاں گڑیا کھیلتی تھیں'' اب یکا یک جوان ہوئیں تو ماں باپ کی راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ لڑکے ان سے بھی دس ہاتھ آگے تھے ـــ اماں باوا کے ہاتھ میں بیٹے کی کمائی بعد میں آتی تھی ـــ کمائی کی حق دار پہلے آتی تھی ـــ کتنے رومانس گھر میں پروان چڑھے۔ اور وہ بھولی بھالی، قاصد بن کر خوشبو میں بسے لفافے اِدھر سے اُدھر پہنچاتی رہی ـــ ان مہکتے رقعوں میں کوئی پُرزہ اس کے نام کا نہ ہوتا۔ صولت اپنے ہاتھوں سے خاندان کی لڑکیوں کے جہیز کے جوڑے ٹانکتی رہیں۔ اور بری کے جوڑے تیار کرتی رہیں لیکن اپنی بیٹی کے نام کا کوئی جوڑا سینا ان کے مقدر میں نہیں تھا۔ اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب کہکشاں کا دل بھی پائل کی چھن چھن اور چوڑیوں کی کھن کھن سن کر مچلنے لگا۔ لیکن اپنا قد دیکھ کر سارے جذبات سرد پڑ جاتے۔ اور پھر وہ حادثہ پیش آ گیا۔ وہ ایک حادثہ ہی تو تھا۔ وہ بڑی عجلت میں اُبٹن کا پیالہ لیے عروسہ کے کمرے کی طرف جا رہی تھی ـــــ

کل ہی عروسہ مانجھے بیٹھی تھی ـــ اور نائین خالہ اُبٹن لاؤ کی دہائی ڈال رہی تھیں کہ گیلے فرش پر اس کا پاؤں پھسلا اور پھر شاہ رخ نے اسے سنبھال لیا ـــ لیکن یہ سنبھالنا اس کے لیے قیامت بن گیا ـــ کاش شاہ رُخ نے اسے گر جانے دیا ہوتا ـــ اسے چوٹ ہی تو لگتی زیادہ سے زیادہ جسم کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ـــ جو بھی ہوتا لیکن یہ تو نہ ہوتا۔ اب اپنا زخم زخمِ دل وہ کس کو دکھاتی۔ اور اپنے آپ سے بھی کیسے چھپاتی کہ پہلی بار دل پر چوٹ کھائی تھی۔ نہ دکھانے کا تجربہ تھا۔ نہ چھپانے کے رموز سے آگاہی تھی ـــ

کیا گھر میں کسی کو بھی احساس نہیں تھا کہ وہ اٹھارہ برس کی بھرپور جوان لڑکی ہے۔ قد کم ہونے سے جذبات اور احساسات تو کم نہیں ہو جاتے — اور یہ شاہ رُخ — ؟ کیا اسے بھی کوئی احساس نہیں ہے؟ اگر وہ اسی دوران اس ناخوشگوار حقیقت سے آگاہ نہ ہوتی کہ بچپن میں اس کی منگنی شاہ رُخ سے ہوئی تھی تو شاید اسے بھی کچھ احساس نہ ہوتا — لیکن شاہ رخ کی آمد کے ساتھ ہی اس کی شادی کے تذکرے بھی زور پکڑنے لگے۔ یہی وقت تھا جب گھر والوں کو اس کی اور شاہ رُخ کی منگنی کا واقعہ یاد آیا۔ اور کسی میں تو اتنی ہمت نہیں کہ بڑی چچی کے منہ لگتا۔ یا انہیں یاددہانی کراتا لیکن اچھی امی ایک منہ پھٹ اور صاف گو تھیں۔ ان سے نہیں رہا گیا تو بڑی چچی سے بلا جھجک کہہ دیا —

''بڑی دلہن! اس خاندان میں آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بزرگ زبان دے کر پھر جائے۔ لیکن تم نے ان روایات کو بدل ڈالا — ''

''میں سمجھی نہیں اچھی امی۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟'' ——

''کیا تم بھول گئیں کہ تم نے صولت سے کہکشاں کا ہاتھ مانگا تھا۔ اور بہت دھوم دھام سے منگنی کی تھی۔''

''مجھے سب یاد ہے۔ کچھ نہیں بھولی۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ کہکشاں کا قد اتنا چھوٹا رہ جائے گا۔ آپ ہی انصاف سے کہیں کہ شاہ رُخ کا جوڑ اس کے ساتھ مناسب ہوگا؟'' —

''اگر خدانہ کرے شاہ رخ میں کوئی عیب پیدا ہو جاتا؟ کیا اس وقت بھی تم یہی کہتیں؟''

''اب اس بات کا کیا ذکر اچھی امی۔ میں اپنے بیٹے کی دشمن نہیں ہوں جو اس کی قسمت ایک بونی کے ساتھ پھوڑ دوں۔ اگر آپ کو اس سے ایسی ہی ہمدردی ہے تو شاہ زیب کے ساتھ اس کو بیاہ لائیں۔ یہ ثواب آپ ہی کما لیں'' —

ایک طنزیہ ہنسی کے ساتھ بات ختم کر کے وہ دندناتی ہوئی چلی گئیں۔ جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی کہکشاں قریب کے دالان میں کسی کام سے آئی تھیں — اور اپنا ذکر سن کر

ٹھٹھک گئی تھی— پھر بڑی چچی کی زبان سے نکلے ہوئے تیر اس کے کلیجے میں تراز د ہو گئے۔ اور وہ ایک تخت پر ڈھے گئی۔ کاش اس نے یہ سب نہ سنا ہوتا۔

برسوں کے بعد شاہ رخ اپنی تعلیم مکمل کر کے اور ٹریننگ پوری کر کے گھر آیا تھا۔ پوسٹنگ کا آڈر اس کی جیب میں تھا۔ اور بڑی دلہن بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کے لیے بے قرار تھیں۔ یوں تو بڑے مکان میں اب بھی کئی لڑکیاں شادی کے قابل موجود تھیں جن کے ماں باپ اسے داماد بنانے کے لیے بلبلا رہے تھے— لیکن بڑی دلہن گھر کی مرغیوں کو دانہ ڈالنے کے لئے قطعی تیار نہیں تھیں۔ بلکہ انھیں تو دن رات یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ کہیں کوئی چڑیل ان کے شہزادے جیسے بیٹے سے نہ چمٹ جائے۔ وہ دن رات ایک کر کے اچھے سے اچھے گھرانوں میں لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ تب ہی اچھی امی نے بچپن کی منگنی کا راز فاش کر دیا۔ اسے بڑی چچی کی عنائتیں یاد آ گئیں اور اس نے الماری اُلٹ پلٹ کر ڈالی۔ الماری کے نچلے خانے میں بھولی بسری یادوں کی طرح کچھ فراکیں— زیورات چوڑیاں ار نہ جانے کیا اَلا بلا ڈھیر تھا۔ خدا جانے اماں نے اسے بیش بہا خزانے کی طرح اب تک کیوں سنبھال کر رکھا تھا— یہ تو ماضی کے وہ زہریلے ناگ تھے۔ جو اسے دن رات ڈس رہے تھے— اس کے قد کے ساتھ بڑی چچی کے ارمان اور چاؤ چونچلے بھی ٹھٹھر گئے تھے— خیر اس کے لئے انھیں قصوروار ٹھہرانا بھی درست نہیں تھا۔ پھر صحیح کیا تھا؟— اس کا مختصر سا وجود— جس کے لیے وہ قصوروار نہیں تھی۔ اس کے جذبات— جن پر اس کو اختیار نہیں تھا—— یا پھر اس کی یہ خطا تھی کہ خدا نے اسے عورت کے روپ میں تخلیق کیا—— کوئی تو قصوروار ضرور تھا لیکن سزا کی مستحق وہ ٹھہرائی گئی—

شاہ رُخ نے ماں کی پریشانی کو دو لفظوں میں ختم کر دیا۔ اور عنبرین کا نام بتا دیا۔ جو اس کی کلاس فیلو تھی اور اسے پسند بھی کرتی تھی۔ یوں بھی عنبرین ہر لحاظ سے ان کے معیار پر پوری اترتی تھی— وہ رئیس گھرانے کی تعلیم یافتہ اور ماڈرن لڑکی تھی۔ اپنے ساتھ بنگلہ، کار اور لاکھوں کا جہیز بھی لا رہی تھی۔ بڑی دلہن نے ہنسی خوشی رشتہ پکّا کر دیا۔

رشتہ ہوتے ہی زور و شور سے شاہ رُخ کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ بڑے

مکان میں شادی کی گہما گہمی اور چہل پہل دیکھ کر لگتا تھا کہ بڑی دلہن اپنے سارے ارمان جی کھول کر پورے کریں گی۔ مانجھے سے ایک ہفتہ پہلے ہی لڑکیوں نے ڈھولک رکھ دی۔ اور لڑ جھگڑ کر نیگ وصول کیا۔ مانجھا بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ بارات کے دن شاہ رخ دولہا بنا۔ تو بہنوں نے بڑے چاؤ سے اس کے سر پر آنچل ڈالا۔ کہکشاں کسی موقع پر کسی رسم میں نظر نہیں آئی۔ کس کو پڑی تھی کہ اس کی غیر موجودگی کا نوٹس لیتا۔ اتنے دھوم دھڑکے میں وہ بھلا کسے یاد رہتی۔ صولت البتہ ہر کام میں پیش پیش تھیں بلکہ دل کا درد چھپانے کے لیے کچھ زیادہ ہی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں ــــ اس کوشش میں وہ کچھ اتنا ہلکان ہوئیں کہ بیٹی کو بھی بھول گئیں۔ کاروں کا سجا ہوا قافلہ بینڈ باجے اور آتش بازی کے ساتھ دلہن کے گھر روانہ ہوا تو صولت کام کا عذر کر کے گھر پر ہی رُک گئیں۔ جن آنسوؤں کو وہ کئی دن سے پلکوں کی اوٹ میں رو کے ہوئے تھیں بے روک ٹوک بہہ نکلے۔ اور تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔ بیٹی کی بدنصیبی پر وہ برسوں سے کُڑھ رہی تھیں۔ لیکن آج سے زیادہ اپنی بے بسی کا احساس پہلے کبھی نہیں ہوا تھا ــــ خدا جانے وہ کس کونے میں چھپی بیٹھی تھی ــــ ان کی نامُراد اور بدنصیب بچی کا کیا قصور تھا؟ ــــ

آدھی رات کے بعد دلہن بیاہ کر گھر آئی تو رسموں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ شاہ رُخ کا مارے تھکن کے بُرا حال تھا۔ مانجھے سے لے کر اب تک خاندانی رسموں نے ان کو بے زار کر دیا تھا ــــ اس وقت وہ سب کی آنکھ بچا کر بالا خانہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے داخل ہوئے تھے کے دروازے ہی پر ٹھٹھک کر رک گئے۔ جیسے زمانے کی رفتار تھم گئی ــــ

ان کے دوستوں نے کئی دن کی محنت کے بعد یہ حجلۂ عروسی تیار کیا تھا ــــ اور فرش سے لے کر چھت تک اسے بڑی خوبصورتی سے آراستہ کیا تھا ــــ پھولوں کی لڑیاں ڈبل بیڈ کی چھت گیری سے لے کر فرش تک لٹک رہی تھیں۔ گلابوں کی خوشبو سے پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ گلابی بیڈ کور پر بیلے کی کلیاں اور گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں ــــ فوم کے نرم و گداز تکیوں پر سر رکھے ایک ننھی سی دلہن سیج پر محوِ خواب تھی۔ زر کارڈ دوپٹے کے آنچل نے اس کا آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ لبوں پر ملکوتی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی ــــ اور گھنیری پلکوں تلے نہ جانے

کتنے حسین سپنے سجوئے وہ گہری نیند میں ڈوبی اپنے اطراف واکناف سے بے خبر ایک پیاری سی مدہوشی میں غرق تھی جیسے اپنے ساجن کا انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھ لگ گئی ہو ــــ وہ اسے چھوئے گا ــــ اور وہ جی اُٹھے گی ــــ

شاہ رُخ کی نظروں کے سامنے سے اچانک ایک ایک کر کے سارے پردے ہٹ گئے ۔ اگلے پل وہ مُڑے اور کمرے سے باہر نکل آئے ۔ بالا خانہ کی سیڑھیاں اُتر کر وہ سب کی نظروں سے بچتے ہوئے گھر کے باہر نکل گئے ۔

شبِ عروسی کے تمام خوبصورت تصورات بھاپ بن کر اُڑ گئے تھے ــــ اور وہ خالی دل اور پراگندہ ذہن کے ساتھ ویران سڑکوں پر رواں دواں تھے ــــ



کچّی دیوار

کریم نے ذرا جھک کر باہر دیکھا۔ گھور اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا___ بس بارش کا شور تھا اور زمین سے آسمان تک ایک کالی چادر سی تنی تھی___

کئی روز سے بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ جیسے قدرت نے ہزاروں جھرنوں اور آبشاروں کا رُخ آسمان سے زمین کی سمت کر دیا ہو___ رات تو رات دن میں بھی اندھیرا چھایا رہتا تھا___ آسمان سے نظر پلٹتی تو کوٹھری کی چھت پر مرکوز ہو جاتی۔ دن رات کی ٹپ ٹپ کانوں میں خنجر کی مانند گھاؤ ڈال رہی تھی۔ بوسیدہ دیواروں کے سہارے اٹکی ہوئی چھت کسی وقت بھی گر سکتی تھی___

بچوں نے گھر بھر کے ٹیڑھے میڑھے برتن اور مٹی کی ہانڈیاں زمین پر رکھ دی تھیں۔ جب کوئی برتن پانی سے بھر جاتا، بچے خوشی خوشی اسے باہر صحن میں خالی کر دیتے۔ انہیں تو جیسے ایک دلچسپ کھیل ہاتھ لگ گیا تھا۔ بارش کے سبب باہر نکلنا تو بند ہی تھا___ ایسے میں کچھ تو کرنا ہی تھا۔ سو یہی سہی___ بارش کے ساتھ آمنہ کی بڑبڑاہٹ بھی بڑھتی جا رہی تھی___ غریب دال چاول یا کھچڑی ابالنے کے لئے کوئلے کی انگیٹھی اِدھر سے اُدھر رکھتی پھرتی تھی___ چولہا تو کئی دن سے ٹھنڈا پڑا تھا۔ گیلی زمین، گیلی لکڑیاں___ چولہا کیا خاک جلتا___ اور پھر کون سے پکوان بنانا تھے___ نہ جانے کس طرح قرض ادھار کر کے پیٹ کی آگ بجھانے کا جتن ہو رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے کام بھی بند تھا___ روز کنواں کھودنا اور پانی پینا جو ٹھہرا___ ایسے موسم میں مزدوری کہاں ملتی___؟

روز صبح کریم مزدوروں کے اڈے پر پہنچ جاتا۔ کام مل جاتا تو شام کو واپس آتے ہوئے آٹا، دال، چاول خرید لاتا۔ دن خالی جاتا تو محلّے کے بنئے سے ادھار لے کر کام چلاتا۔ میاں بیوی خود آدھا پیٹ کھائیں یا بھوکے سو رہیں مگر چاروں بچوں کو تھوڑا بہت کھلانے کے لئے بنئے کی خوشامد کرنا پڑتی تھی — وہ لوگ گاؤں میں تھے تو مزدوری کم ملتی تھی کبھی کبھی تو پیسوں کے بجائے موٹے اناج اور گوپر اکتفا کرنی پڑتی تھی — جب فاقوں کی نوبت آگئی تو کریم نے شہر جا کر محنت مزدوری کرنے کا فیصلہ کیا۔ آمنہ نے دو بچوں کے ساتھ گاؤں میں رہنے سے انکار کیا اور ساتھ چلنے کی ضد کی لیکن اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر روک دیا۔ اکیلی جان کا کیا۔ کہیں پڑا رہتا۔ لیکن بیوی بچے ساتھ لے جاتا تو ٹھکانہ کہاں ملتا — ؟ سو وہ اکیلا ہی چلا گیا۔ گاؤں کے کئی لوگ شہر میں مزدوری کرتے تھے — وہ بھی ان کے ساتھ اڈے پر جانے لگا۔ اونچی اونچی پاڑھوں پر چڑھ کر اینٹیں اور مصالحہ پہنچانا آسان نہیں تھا — شروع شروع میں تو اسے بہت ڈر لگا۔ دھیرے دھیرے عادت ہوگئی۔ خدا جانے لوگوں کو آسمان چھوتی عمارتیں بنوانے کیا کیا خبط تھا — نہ آنگن ہوتا نہ کھلا آسمان نظر آتا۔ بس کبوتر کی کابک جیسے چھوٹے چھوٹے مکان تلے اوپر بناتے چلے جاتے اور بلڈنگیں کھڑی ہو جاتیں۔

یہاں مزدوری تو ٹھیک ٹھاک ملتی تھی۔ لیکن آدھے سے زیادہ پیسے پیٹ میں اُتر جاتے تھے۔ جو پیسے بچاتا وہ بیکاری کے دنوں میں کھا پی کر برابر ہو جاتے۔ چھ مہینے میں مشکل سے ڈھائی سو روپے گھر بھیج سکا تھا۔ وہاں آمنہ پریشان رہتی تھی — یہاں وہ بیوی بچّوں کی مصیبت سوچ کر پریشان رہتا تھا۔ آخر اس نے گاؤں کا پھیرا لگایا — اور بیوی بچوں کو ساتھ لے آیا کہ جو ہو گا مل بانٹ کر کھائیں گے — کم از کم سُکھ دُکھ میں سب ساتھ تو ہوں گے۔ بڑی مشکل سے ایک کوٹھری ملی تھی۔ کرایہ تو کم تھا۔ صرف پچاس روپے ماہوار۔ لیکن کوٹھری کی حالت دیکھتے ہوئے یہ بھی زیادہ تھا — جو کوٹھریاں اچھی حالت میں تھیں ان کا کرایہ اتنا زیادہ تھا کہ سُن کر ہوش اڑ جاتے تھے — اس کا جیسا پچاس روپے روز پانے والا مزدور دو ڈھائی سو روپے ماہوار کرایہ کہاں سے دیتا — اور پھر مہینہ اتنی جلدی گذرتا تھا کہ ابھی کرایہ دیا اور دیکھتے دیکھتے مہینہ ختم — پچاس روپے کی تلوار ہر وقت سر پر لٹکتی رہتی تھی — اوپر سے کوٹھری کی مرمت

بھی اس کے دمے تھی — اتنا کم کرایہ لے کر مالک مکان ہزاروں روپے کیوں لگاتا؟

آمنہ زمین اور دیواروں کی لپائی پُتائی کرتی — اور کریم کسی طرح مصالحہ لگا کر چھت کی مرمت کرتا۔ چھاپنیں بوسیدہ ہو کر گر گئی تھیں۔ جگہ جگہ سے مٹی جھڑتی رہتی تھی۔ گرمی اور جاڑا تو کسی طرح کٹ جاتا تھا — مصیبت تو برسات کی تھی — چھت کے شگافوں میں سمینٹ اور بالو کا مصالحہ لگا کر بھرنے کے باوجود اس کا ٹپکنا بند نہیں ہوتا تھا پوری چھت ہی مرمت طلب تھی۔ اور اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ نئے سرے سے چھت بنواتا — چار برس میں دو بچوں کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ مزدوری بڑھی تو مہنگائی بھی بڑھ گئی۔ پھر کبھی ایک بچہ بیمار ہوتا کبھی دوسرا — چار زچگیاں جھیل کر آمنہ بھی روگی ہو گئی تھی — کریم اُور ٹائیم کے لئے ٹھیکے داروں کی خوشامد کرتا کہ چار پیسے زیادہ کما لے۔ لیکن ایک وہی اکیلا تو پریشان نہیں تھا۔ اس کے جیسے نہ جانے کتنے تھے — گاؤں سے آیا تھا تو جسم مضبوط تھا۔ شہر نے اس کا سارا خون چُوس کر بالکل پھوک کر دیا تھا۔ لوگ اڈے پر آتے تو ہٹے کٹے مزدور چھانٹ کر لے جاتے — وہ دس پانچ کم لے کر جانے پر تیار ہو جاتا — تب بھی اسے نظر انداز کر دیتے۔ اور اس کا دن بے کار ہو جاتا — گھر واپس جانے کو جی نہ چاہتا — آمنہ اور بچوں کی نظروں میں چھپے سوال اسے شرمندہ کر دیتے اور وہ منہ چھپاتا پھرتا —

اس دن آمنہ نے 'پانچویں' کی کی آمد کی خبر دی تو اس کا پارہ چڑھ گیا۔

''بھاگوان کب تک پلّے جنتی رہے گی؟'' — کبھی سوچا ہے کہ اس فوج کے پیٹ کا دوزخ کیسے بھرے گا؟

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے سارا قصور میرا ہے؟'' ''نہیں — میں ہی الّو کا پٹھا ہوں؟'' —

آمنہ روہانسی ہو گئی۔

''پچھلی بار کتنا کتنا ڈاکٹرنی نے کہا تھا آپریسن (آپریشن) کرالو۔ تم نے منع کر دیا'' آمنہ نے پھُسپھُسا کر کہا۔

''منع یوں کیا تھا کہ مر مرا جاتی تو ان چار چار پلّوں کو کون پالتا — اور یہ بھی کیا پتہ تھا

کہ سال پیچھے بچہ جنتی رہے گی؟''—

''اللہ کی مرجی—(مرضی) اس میں بندے کا کیا دکھل (دخل)—''

''تو یہ بھی اللہ کی مرجی (مرضی) ہے کہ بھوکے مرو۔ پھر کیوں ہائے ہائے کرتی ہے؟''—

''اپنے لئے تو نہیں کرتی۔ بچوں کو بھوکا پیاسا نہیں دیکھا جاتا۔ اس سے تو گاؤں اچھا تھا موٹا جھوٹا کھانے کو تو ملتا تھا۔ کچھ نہیں تو اُپلے تھاپ کر حلوائی کو گن دیتی تھی— کھیتوں سے ساگ کھونٹ لاتی تھی—''

''تو ہی شہر آنے کے لئے مری جارہی تھی—اب مرا اچھی طرو۔ (طرح) اور میری جان چھوڑ دے''—

''اس عمر میں تیری جان چھوڑ کر کس کی جان کو روؤں گی؟''

''رونے کے لئے بھی تجھے میری ہی جان ملی ہے؟'' اسے ہنسی آ گئی—

''اب کی بار بچی تو آپریسن (آپریشن) جرور (ضرور) کرالوں گی۔ تو نے منع کیا۔ تب بھی نہ مانوں گی''—

''جرور (ضرور) کرالینا—اور ہاں تیرے بھیتر جو بھی اُلا بَلا ہے۔ اس سے ہمیسہ (ہمیشہ) کے لئے چھٹکارا پالینا''—

آمنہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو رونے بیٹھ گئی اور کریم کو اس پر ترس آ گیا—

''دیکھو آمو— بچے مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ لیکن انھیں ننگا بھوکا دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔ جی کرتا ہے کہ کہیں جا کر ڈوب مروں نالت (لعنت) ہے میرے اوپر کہ اپنی عورت کو کوئی سُکھ نہیں دے پاتا۔ اور یہ بچے فاکے (فاقے) کرتے ہیں—یا آدھا پیٹ کھاتے ہیں۔''

''بس جی ایسی باتیں نہ کرو— مریں تمہارے دُسمن (دشمن)'' اُمنہ سب کچھ بھول بھال کر اس کی دل جوئی کرنے لگی اور کریم بھی اس کو دلاسہ دینے لگا۔

''یہ چھت دیکھ رہی ہو؟'' اس نے اُنگلی سے اوپر اشارہ کیا—

''روج (روز) دیکھتی ہوں۔ اب کی یہ بارش میں نہ رکنے والی—''

سوچتا ہوں خاں صاحب سے بات کروں۔ تھوڑی بہت مرمت کرادیں تو اچھا ہے''—

''وہ ایک نمبر کا کنجوس ہے۔ ایک دھیلہ کھرچ (خرچ) نہیں کرے گا۔ بھلے ہم دب کر مر کیوں نہ جائیں''—

''کہہ دیں گے کرائے میں دس بیس روپے بھلے بڑھا دے۔ لیکن چھت ٹھیک کرادے''—

''وہ کچھ نہیں کرے گا۔ تمہیں پیسوں کا انجام (انتظام) کر کے تھوڑی بہت لیپا پوتی کرادو''—

''ہونی کو ہم روک نہیں سکتے—اور کچھ اپنے بس میں نہیں ہے اب جئیں—یا مریں''—

کریم نے مایوسی سے کہا۔ اور چھت کو تکنے لگا۔

بارش کا موسم شروع ہوا تو چھت چھلنی کی طرح ٹپکنے لگی اور اب تو کئی روز کی موسلا دھار بارش نے ہر سال کر کسر پوری کردی تھی۔ وہ کئی روز سے گھر پر بے کار بیٹھا تھا۔ اور دن رات میاں بیوی بارش رکنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ سوتے جاگتے راتیں گذر رہی تھیں۔ بادل زور سے گرجتا تو لگتا کہ چھت اور دیواریں ان کے سر پر گر پڑیں گی۔ بجلی کڑکتی—تو آمنہ دہل کر بچوں کو کھینچ کر کلیجے سے لگا لیتی—خدا خدا کر کے بارش کا زور ٹوٹا۔ صبح آسمان بالکل صاف تھا سورج کئی دن کے بعد نکلا تھا—پاس پڑوس والے اپنے اپنے گھروں کی مرمت میں مصروف تھے۔ کوئی پرنالہ ٹھیک کر رہا تھا۔ کوئی آنگن میں مٹی ڈال رہا تھا۔ لیکن کریم کو اڈے پر جانے کی جلدی تھی—

''آج کام مل جائے تو واپس آتے ہوئے سمیٹ بالو جرور (ضرور) لیتے آنا''—

آمنہ نے یاد دلایا—

''دعا کر کام مل جائے—دال روٹی کا سہارا ہو جائے۔ تجھے سیمنٹ بالو کی پڑی ہے۔ کریم کھسیانا ہو گیا۔

''نہ لانا— کہیں اور ٹھکانہ دیکھ لو۔ بچے دب کر مر جائیں گے تو دال روٹی دھری رہ جائے گی''—

''تو تو ایسے کہہ رہی ہے جیسے بادا کا محل چھوڑ کر آئی ہے۔ بڑا آسان ہے مکان ملنا۔ بس چپ کر۔ جاتے سمےَ بک بک نہ کر''—اس نے جل کر بیوی کو ڈانٹا۔

''اس سے تو اچھا ہے کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ جائیں—اس کوٹھری سے تو میدان بھلا—مرنے کا ڈر تو نہ ہوگا''—

''پھر وہی رونا—میدان میں بیٹھ۔ یا کہیں اور جا کر مر''—

کریم انگوچھا کاندھے پر ڈال کر بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ آمنہ بھیگے ہوئے بستر اور کپڑے سمیٹنے لگی کہ دھوپ میں ڈال کر سکھا لے—بارش کا کیا ٹھیک— کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ بھیگ کر بچے تو بیمار ہو ہی گئے تھے۔ رات سے چھوٹے کو بخار ہو گیا تھا—دوا دارو کے بھی پیسے نہیں تھے—جوشاندہ پلانے سے بھی کہیں بخار ٹھیک ہوتا ہے۔ محلّے کا ڈاکٹر بھی پانچ روپے سے کم کی دوا نہیں دیتا۔ پھر بھی مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

آمنہ سارا دن سامان کی رکھا دھری کرتی رہی۔ کریم اڈے سے واپس نہیں آیا تھا—اس کا مطلب تھا کہ آج اسے کام مل گیا ہے—

اڈے پر مزدوروں کا ہجوم تھا۔ کام لینے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ اسے بھی کام مل گیا۔ دوسرے مزدوروں سے اس نے پانچ روپے کم بتائے تھے۔ دوپہر تک اس کے ہاتھ پاؤں کمزوری کی وجہ سے سنسنانے لگے تو اس نے مالک سے ایک روپیہ لے کر چنے کھائے۔ پانی پی کر کچھ جان آئی۔ صبح بنا دودھ کی گڑ کی چائے پی تھی—رات میں بھی دو نوالے چاول کے کھائے تھے۔ آمنہ سے کہہ دیا کہ بھوک نہیں ہے۔ خود پیٹ بھر لیتا۔ تو آمنہ غریب بھوکی رہ جاتی— پھر ان دنوں تو اس کی کوکھ میں پلتا ہوا 'جناور' بھی اس کا خون چوس رہا تھا۔ ایسے میں اسے اور کچھ نہیں تو پیٹ بھر روٹی ہی مل جاتی تو یہی بہت تھا— لیکن وہ بھی روز نہیں ملتی تھی—بارش نہ ہوئی اور اسی طرح روز کام ملتا رہا تو وہ چھت کی مرمت بھی کر دے گا اور بنئے کا ادھار بھی چکا دے گا۔ اور آمنہ سے صاف صاف کہہ دے گا کہ وہ سب سے پہلے کھا لیا

کرے۔ کتنی کمزور ہوگئی ہے۔ کیسا بھرا بھرا، کسا کسا بدن تھا اس کا کہ ہاتھ رکھو تو پھسل پھسل جائے اور اب— ''اب تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگئی ہے نامراد''—

دن میں ایک آدھ بار پانی کا ہلکا سا چھینٹا پڑا لیکن کام ہوتا رہا۔ پانچ بجے چھٹی ہوگئی۔ مزدوری کے پیسے گن کر پلاسٹک کی تھیلی میں لپیٹ کر حفاظت سے جیب میں رکھے راستے سے تھوڑا سا کھانے پینے کا سامان لیا اور پھر منا بابو کی دوکان سے دو کلو سیمنٹ اور بالو خرید کر انگوچھے میں باندھی بادل گھر آئے تھے— بارش ہونے کے آثار نظر آرہے تھے۔ وہ تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا— اپنے محلّے میں گھستے ہی اس کی رفتار سست ہوگئی۔ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں خاں صاحب کی عمارت تھی جس کے اونچے پھاٹک کے باہر لائین سے کوٹھریاں بنی تھیں— انھیں میں سے ایک کوٹھری اس کی تھی۔ گندگی اتنی تھی کہ بدبو کے مارے دماغ پھٹا جارہا تھا۔ اس گندگی سے گذر کر وہ اپنی گلی میں داخل ہوا تو محلّے والوں کا ہجوم نظر آیا۔ اللہ جانے کیا بات تھی۔ شاید آج پھر کلّو نے تاڑی پی کر جورو کو پیٹا ہوگا۔ یا کسی نے جھگڑا کیا ہوگا۔ محلّے والے بھی ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے تھے— ذرا سی ہُش ہُش ہوئی۔ اور سب جمع ہوگئے۔ کوئی وکیل بن جاتا— کوئی گواہ۔ اور جج تو ہمیشہ خاں صاحب ہی بنتے تھے۔ کبھی جو انصاف کی بات کریں۔ ہمیشہ زیادتی کرنے والے کی طرف داری کرتے تھے— اور کمزور کو دباتے تھے۔ خاں صاحب جو ٹھہرے— اُلٹی کھوپڑی— ''

''لو— وہ کریم بھی آگیا''— مجمع سے کسی نے آواز لگائی وہ ٹھٹھک گیا— دو چار لوگ اس کے پاس دوڑ کر آگئے—

''کریم بھائی— تمہاری کوٹھری'' اَمدو نے اٹک اٹک کر کہا—

''کیا ہوا بھیا؟''— وہ ساری جان سے کانپ گیا—

''ڈھے گئی— پوری کی پوری زمین پر آرہی—

کریم کے ہاتھ سے سامان چھوٹ گیا۔ وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا— اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا— بیوی اور بچوں کی صورتیں نظروں میں پھر گئیں— آس پاس کا سارا منظر اوجھل ہوگیا تھا— نہ لوگوں کا ہجوم دکھائی دے رہا تھا— نہ کسی کی آواز سنائی دے

رہی تھی — نہ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا — بس ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ کانوں میں پڑ رہی تھی — کسی نے اس کی نبض تھام لی —

''ارے — یہ تو ختم ہو گیا — مر گیا بے چارہ'' —

''مر گیا — لیکن ابھی ابھی تو'' —

ہجوم کو چیرتی۔ لوگوں کو ہٹاتی۔ دھکے دیتی آمنہ بدحواس ہو کر دوڑی — اور کریم کے پاس آ کر رک گئی۔ گھبرا کر پوچھنے لگی —

''کیا ہوا — یہ زمین پر کیوں پڑے ہیں'' —

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو وہ جھک کر میاں کو جھنجھوڑنے لگی — اسے چیخ چیخ کر آوازیں دینے لگی — لیکن بولتا کون؟۔ وہ تو اپنی کوٹھری سے زیادہ بوسیدہ ثابت ہوا تھا — جو بیوی بچوں کی موت کے تصور ہی سے ڈھے گیا تھا —

آمنہ اس کے بے جان جسم سے لپٹی رو رہی تھی — اور چاروں بچے کوٹھری کے ملبے سے ٹوٹا پھوٹا سامان نکالنے میں مگن تھے — آج انہیں ایک اور دلچسپ کھیل ہاتھ لگ گیا تھا۔



نئے موسم کی نئی فصل

برسوں سے آسمان کے رنگ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، ویسا ہی نیلا اُجلا اُجلا رنگ، وہی چمکیلی دھوپ اور سورج کی وہی آب وتاب۔ گویا سورج دیوتا نے اپنا آسن تبدیل نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔

پانی سے بوجھل بھورے اور کالے بادلوں کے قافلے راستہ بھٹک کر نہ جانے کس دیس نکل گئے تھے۔ موسم کا کارواں بھی ایک جگہ تھم سا گیا تھا۔ اسے نہ ساون کی فکر تھی نہ بھادوں کی۔ اس کے مزاج کی یکسانیت بھی حیرت انگیز تھی۔ سورج کا گولا بھی سُرخ بھبھوکا سادن بھر دہکتا رہتا۔ اس کی روپہلی کرنیں آگ برساتیں۔ اور جب یہ آگ برساتی کرنیں نیزہ کی اَنی بن کر زمین کی چھاتی میں دھنس جاتیں تو زمین لوہے کی مانند تپنے لگتی۔ ہر پتھر انگارہ بن جاتا ـــــ اور ہر ذرہ چنگاری۔ ہوا کے گرم جھونکے بھٹی سے نکلی ہوئی آنچ کی مانند لپکتے تو ان کی زد میں آنے والی ہر شے جھلس جاتی۔

زمین کے باسیوں کی ہر رات صبح کے انتظار میں بیتتی ـــ سویرا ہوتا، سورج آہستہ آہستہ اوپر اُٹھتا اور سَوا نیزہ پر آکر تھم جاتا۔ بارش کے ایک قطرے کو ترسی ہوئی زمین سخت ہوکر چٹخ گئی تھی اس کی دراڑوں میں چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے پناہ لیتے۔ لیکن پناہ کہاں تھی؟ کھیت ویران پڑے تھے۔ کھلیانوں میں خاک اُڑ رہی تھی۔ نالے اور تالاب سوکھ گئے تھے۔ کنوؤں کا پانی نیچے اُترتے اُترتے پاتال میں غائب ہوگیا تھا۔ مٹکوں میں اناج کے دانے روز بروز گھٹتے جارہے تھے۔ گھروں کے چولہے بھی بس کسی کسی وقت روشن ہوتے

تھے۔ اور پیٹ کا دوزخ ہر وقت دہکتا رہتا تھا — مُکھیا کی چوپال۔ مہاجن کی چوکھٹ اور گاؤں کے چوبارے سنسان پڑے تھے — دُھندلی، گدلی سیکڑوں جوڑ آنکھیں بادلوں کی تلاش میں سارا سارا دن آسمان میں بھٹکتیں اور پتھرا کر واپس آجاتیں۔ دن بیتتا۔ شام اُترتی، مایوسی کنکر بن کر پتھرائی ہوئی آنکھوں میں چبھتی اور لہو رنگ آنسوؤں میں زندگی کا سارا حسن ڈوب جاتا۔ بھوک و پیاس سے نڈھال جسم لاش کی صورت چارپائی کی جھلنگا قبروں میں دفن ہو جاتے۔ اور اُکھڑی اُکھڑی سانسیں زندگی پر تہمت بن کر کمزور چھاتیوں میں ہونکتی پیدا کر دیتیں —

اوّل اوّل سونے جیسے جسم سے چاندی اُتری۔ پھر معصوم لبوں کی مسکراہٹیں چوری ہوئیں۔ جانوروں کے باڑے خالی ہونا شروع ہوئے تو کتنے کرشن کنہیا گھی اور مکھن کو ترس گئے۔ دھرتی کا سینہ چیر کر دانہ اگانے والے مضبوط بازو کمزور ہو کر اپنے پہلو میں لٹکنے لگے۔ کنواریوں کے سنہرے خواب — اور گبرو جوانوں کے مدُھر گیت بھوک کا عفریت ہڑپ کر گیا۔ مہکتے بور کی تلاش میں کوئل نے اُمرائیوں پر لمبی اڑان بھری اور دور نکل گئی۔ اب تو ٹنڈ مُنڈ پیڑوں پر مُردار کی جستجو میں گِدھ ڈیرا جمائے رہتے — گلیوں میں مریل کتے پڑے لوٹا کرتے گاؤں میں کسی کو ان کی وفاداری کی ضرورت نہیں تھی — اپنے سائے سے بھڑکنے اور ہر آہٹ پر بھونکنے والے اب مالکوں کو پہچاننے سے گُریز کرتے تھے — چمکیلے آسمان میں لگھڑ بھَری اور چیلیں منڈلاتیں نئے موسم کی آمد کا پتہ دینے والے پرندوں کی ڈاریں بھی راستہ بدل کر اُڑتیں — اور شام کے جھٹپٹے میں .... — بہت دور کسی تالاب پر گرتیں۔ پورے گاؤں پر شمشان جیسی وحشت اور قبرستان جیسی ویرانی چھائی رہتی —

چند برس پہلے یہی زمین سونا اُگلتی تھی۔ گندم — دھان، جوار اور مکئی کے بوجھ کھلیانوں میں زمین سے آسمان تک لگے رہتے تھے — گھروں کے کوٹھے، دالان، بَردٹھے اور دو چھتیاں اناج کے بوروں سے اٹا اَٹ بھری رہتی تھیں — پِسن ہاری صبح منہ اندھیرے چکی پر بیٹھتی تو شام کو اُٹھتی۔ باڑوں میں جانور صبح و شام ناندوں میں منہ ڈال کر کھلی، بھوسا اور گُوئی سانی کھا کھا کر ڈکراتے دن میں ہری ہری گھاس چباتے۔ اور کسی پوکھر یا گڑھیا میں

مست پڑے رہتے۔ مصیبتوں کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب آس پاس کے ہرے بھرے جنگل کٹنا شروع ہوئے۔ شیشم، دیودار، چیڑ اور آم — بلکہ نیم، پیپل اور بُول تک تیز آروں سے کاٹ کر پھینک دیے گئے — اور حدِ نظر تک — بلکہ اس سے بھی آگے تک چٹیل میدان پڑا رہ گیا۔ رہی سہی قیامت سُوکھے نے ڈھا دی — کئی سال تک بارش نہیں ہوئی۔ یا بہت کم ہوئی۔ ندیاں، نالے اور تالاب سب خشک ہو گئے۔ ہرے بھرے کھیتوں کی جگہ بنجر زمین رہ گئی۔ باغوں میں جھاڑ جھلکاڑ اُگ آیا۔ کوئل کی 'کُوہُو کُوہُو' پن چکّی کی 'ٹِک ٹِک' اور رَہٹ کی 'رُوں رُوں' یہ ساری آوازیں جو گاؤں کی زندگی کا لازمی جزو تھیں — گم ہو گئیں — برسوں سے گاؤں کے کسی گھر میں ڈھولک کی تھاپ پر 'سُہاگ' اور سُوہر کے بول نہیں گونجے تھے کنواریوں کے خواب مہاجن کے پاس رہن ہو گئے تھے اور جوانوں کی باراتیں قرض کی صورت بہی کھاتوں پر چڑھ گئیں۔ جن گھروں میں اناج کے دانے کم رہ گئے تھے ان کے مرد مزدوری کرنے شہر چلے گئے۔ کچھ لوگ آدھا پیٹ کھا کر دن کاٹنے لگے۔ اور کسی غیبی امداد کے انتظار میں روز بہ روز کاہل ہوتے گئے۔ کسان کا پُوت سر پر اناج کے بوجھ کے سوا اور کوئی بوجھ کیسے اُٹھا سکتا تھا۔

ایک صبح شہر سے گاؤں آنے والی اکلوتی سڑک پر گرد و غُبار کی اُوٹ سے ایک بھاری بھرکم۔ فوجی ٹرک نمودار ہوا۔ اور آم کی بغیا کے کنارے رک گیا — فوجی جوانوں نے سڑک سے کود کر پھرتی سے زمین میں لوہے کی مینخیں گاڑیں اور جھٹ پٹ چھولداری کھڑی کر دی۔ کپڑے کی کھلنے، بند ہونے والی کرسیاں ڈالی گئیں۔ میز پر رجسٹر، قلم اور دوات سجائی گئی۔ افسر نما آدمی نے کرسی سنبھالی۔ اور لاپرواہی سے گاؤں کے کچے پکے مکانوں اور بوسیدہ جھونپڑوں کا جائزہ لینے لگا — اس کے آدمی مُکھیا کو تلاش کرنے چلے گئے۔

آگے مُکھیا — اس کے پیچھے مرد — اور ان کی اوٹ میں عورتیں گھونگھٹ سے چہرہ چھپائے، بچّوں کو کولہے پر لادے حاضر ہو گئیں۔ دُبلا پتلا مُکھیا اپنی مٹھی بھر ہڈیاں سنبھالے افسر کے سامنے خوفزدہ کھڑا تھا۔ گاؤں والوں کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے — ان کے چہروں پر کھنچی ہوئی ضرب، جمع، تقسیم کی لکیروں نے انہیں مجسم سوال بنا دیا تھا۔

''ہمیں فوج میں بھرتی کے لئے ہٹے کٹے، اور مضبوط جوان چاہئے'' افسر نے اپنی بات پر زور دے کر کہا — اور اس کی نظریں بھیڑ کا جائزہ لینے لگیں۔ لیکن اسے ایک آدمی بھی ایسا نظر نہیں آیا جس کی چھاتی اور بازوؤں پر ایک پل کے لئے نگاہ ٹکتی — اس نے دل میں انھیں ایک عام سی گالی دی۔

''یہ مریل، کمزور آدمی بھلا فوج میں جا کر کون سا کارنامہ انجام دیں گے۔ یہ تو یہیں کے یہیں مرنے پر تیار ہیں'' —

''حُجور! آپ جس کو مرجی ہو چھانٹ لیں۔ سب ہی محنتی اور سیانے ہیں'' مُکھیا نے ہاتھ جوڑ کر خوشامد کی اور شاید اس کے گھگھیانے پر افسر کو ترس آ گیا۔ نرمی سے کہا —

''ٹھیک ہے تم سب کے نام لکھاؤ۔ دیکھیں گے ان میں سے کتنے لوگ 'پاس' ہوتے ہیں۔ کل ہمارا ڈاکٹر ان کا میڈیکل چیک اپ کرے گا'' —

مُکھیا نے ایک ایک آدمی کا نام لکھانا شروع کیا۔ گاؤں کے سارے مرد بخوشی جنگ پر جانے کے لئے تیار تھے۔ پہلے جب کبھی جبری بھرتی ہوتی تھی تو 'لام' کا نام سن کر گھر گھر کہرام مچ جاتا تھا — مائیں اپنے بیٹوں کو چھپاتی پھرتی تھیں اور بیاہتا اپنے سُہاگ کی دہائی ڈالتی تھیں۔ لیکن آج مائیں چُپ تھیں اور سُہاگنیں بھی خاموش تھیں۔ ماں کی ممتا اور سہاگ کی لالی پر بھوک غالب آ گئی تھی۔ اور جب موت ہر وقت آس پاس منڈلا رہی ہو تو اس سے ڈرنا کیسا؟

دوسرے دن فوجی ڈاکٹر آیا۔ اس نے جوانوں کی تھوڑی سی ناپ جُوکھ کی۔ جھوٹ مُوٹ وزن دیکھا — اور دھنسی ہوئی چھاتیاں ٹھونک بجا کر سب کو 'پاس' کر دیا اس وقت سرکار کو جنگ کے تندور میں جھونکنے کے لئے ایندھن کی ضرورت تھی — ڈاکٹر بھی جانتا تھا کہ یہ لوگ لڑنے سے زیادہ مرنے کے لئے موزوں رہیں گے۔ یا پھر سرکار انھیں کھلا پلا کر — دوڑیں لگوا کر خود ہی جنگ میں لڑنے کے لائق بنا دے گی —

ہفتہ عشرہ میں گاؤں کے بیشتر مرد فوجی ٹرکوں میں بھر کر ٹریننگ کے لئے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ قحط نے کھیت کھلیان اجاڑے اور بھوک نے گھر آنگن کی رَونق

لُوٹ لی۔ کئی بوڑھے کھانستے کھانستے ختم ہو گئے۔ کتنوں نے اچھے دنوں کی آس میں ان کی جگہ سنبھالی۔

عورتوں کو دن رات کاٹنا دوبھر ہو رہے تھے۔ ہر آنکھ میں انتظار کے دیئے روشن تھے — اپنے مردوں کا انتظار بارش کا انتظار — اچھی فصلوں کا انتظار — ان کے روز و شب انتظار کی بیساکھیوں کے سہارے بیت رہے تھے۔

برسوں کے انتظار کے بعد بارش ہوئی بچے کھچے مردوں اور عورتوں نے کھیتوں میں ہل چلایا۔ گڑائی اور بُوائی کے بعد عورتیں اچھی فصل اور اپنے مردوں کے انتظار میں زندگی کی رونق لوٹنے کی دعا کرنے لگیں۔

جنگ ختم ہوگئی۔ مرد گھروں کو واپس آگئے۔ اب پھر وہی رنگ بدلتے موسم تھے۔ اور وہی لہلہاتی فصلیں۔ اور وہی آموں پر مہکتے بور کی دیوانی کوئل کی 'کُوہُو کُوہُو' زندگی اپنی پوری حرارت اور توانائی کے ساتھ رواں دواں تھی — سرکار نے کسانوں کو سُوکھے سے راحت دلانے کے لئے کئی منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا۔ گاؤں، گاؤں نہروں کا جال سا بچھ گیا۔ اور دور دور تک بجلی پہنچائی گئی۔ ٹیوب ویل سے نکلتی ہوئی پانی کی دھار نے کھیتوں کے ساتھ ساتھ کسانوں کی رُوح کو بھی سیراب کردیا۔ سُوکھے کا ڈر ختم ہو چکا تھا۔ اب بارش کے انتظار میں خوف کا عُنصر شامل نہیں تھا۔ ہر نئے موسم میں نئی فصلیں مسکراتی تھیں۔ الھڑ دوشیزاؤں کو ان کے خواب واپس مل گئے تھے۔ نوجوانوں کے ہونٹوں پر زندگی کی خواہش اور اُمنگ سے بھرپور گیت مچلنے لگے تھے۔ سونے جیسے بدن پر چاندی سج گئی تھی۔ اور چُولہے میں دونوں وقت آگ جلتی تھی —

جب گمشدہ سُکھ اور کھوئی ہوئی خوشیاں دوگنی، سہ گُنی ہو کر واپس مل گئیں تو لوگ قحط کی حشر سامانی اور جنگ کی ہولناکی بھول گئے کہ بھولنا انسان کی فطرت ہے۔

وہ صبح کہ ہر صبح سے زیادہ خوش گوار تھی — مسجد سے اذان اور مندر سے شنکھ اور گھنٹیوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اور ہر سُو خالقِ کُل کی عظمت کا اعلان ہو رہا تھا —

''وہ بہت رحم کرنے والا ہے۔ وہ مہربان ہے۔ وہ خدا یا بھگوان جس نے یہ

کائنات تخلیق کی اور انسان کو سب سے اشرف قرار دیا۔ اس نے انسان کو دنیا کی ساری نعمتیں بخشیں اور ان نعمتوں پر اسے نگہبان مقرّر کیا۔ جب وہ نعمتوں، آسائیشوں، سیم و زر اور حکومت واقتدار سے مالا مال ہو گیا تو اسے یاد دلایا۔

'فَبِاَیِّ آلاءِ ربِّکُما تُکَذِّبان'

''تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں سے انکار کرو گے'' تم اس کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''

یہ یاددہانی اس لئے تھی کہ اقتدار کی ہوس اور آسائیشوں کی عادت بندوں کو اس خالقِ کُل جہان سے دور نہ کر دے۔ وہ خود کو قادِر۔ حاکم اور خالق نہ سمجھنے لگے۔

اس خوشگوار صبح جب اُجالا دم بہ دم بڑھ رہا تھا۔ دھوپ میں ہلکی ہلکی تمازت کا احساس ہو رہا تھا۔ اور ہوا مست خرام تھی۔ کسان اپنے بیلوں کو ٹٹکارتے کھیتوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی پیتل کی ننھی گھنٹیاں ایک لئے اور تال سے بج رہی تھیں۔ اور گندم کی جھومتی لہلہاتی فصل کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں ایک نئی فصل رات ہی رات میں اُگ آئی تھی۔

یہ سَر بُریدہ نعشوں کی فصل تھی۔ یہ انسانی سروں کی فصل تھی۔ جگہ جگہ بھورے بھورے دھبّے اور دائرے بھُر بھُری مٹّی میں جذب ہو گئے تھے۔ اور کہیں کہیں۔ سُرخ رنگ کا سیال ٹیڑھی میڑھی لکیریں بناتا بہہ رہا تھا۔

انسانی خون سے سیراب ہونے والے کھیتوں میں اُگنے والی سر بریدہ نعشوں کی فصل دیکھ کر سورج نے پچھم کی طرف تیزی سے اپنا سفر شروع کیا۔ آج اسے اپنا منہ چھپانے کے لئے بادل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی ضرورت تھی۔ لیکن آسمان میں دور دور تک بادلوں کا پتہ نہیں تھا۔ اور اس کی روپہلی کرنیں نیزوں کی انی بن کر آسمانوں میں شگاف ڈال چکی تھیں۔ اور تاحدِ نظر نہ کوئی آسمان تھا۔ نہ زمین۔ بس ہر طرف ایک سُرخ سیال تھا جو زمانہ کو نئی فصل کی بشارت دے رہا تھا۔

☆☆

گالی

مہرُو نے پہلی بار گاؤں کی بڑی حویلی کے باہر پاؤں نکالے — تو پھر پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا — دیکھنے کے لئے وہاں باقی بھی کیا رہا تھا۔ اس کے سر کا سائبان اس سے چھن چکا تھا —— موت کے بے رحم ہاتھوں نے شرافت خاں کو ہمیشہ کے لئے اس سے جدا کر دیا تھا۔ اور اب وہ اس وسیع و عریض دنیا میں بالکل اکیلی تھی — لیکن تین سالہ بیٹا شہاب خاں اس کی تنہائی کا مداوا کرنے کے لئے اس کی چھاتی سے لگا اس کے ساتھ تھا۔ جسے ابھی خود ماں کے سہارے کی ضرورت تھی۔

شرافت خاں نے اپنی خاندانی روایات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مہرُو کو اپنے گھر کی زینت بنایا تو خاندان والوں نے اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر دیا۔ ذات برادری کی بیٹیاں رشتے کی آس میں کنواری بیٹھی رہیں اور ایک غلام زادی حویلی پر راج کرے؟ یہ کھلی زیادتی تھی — مہرُو ان کے ساتھ کھیل کود کر بڑی ہوئی تھی —— لیکن تھی تو شرافت خاں کے خاندانی ملازم کی لڑکی۔ شرافت خاں دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ اس لئے بڑوں کے سارے استدلال اور تاویلیں بے کار ثابت ہوئیں — لیکن مہرُو کے خلاف اوّل دن سے جو گرہیں اہلِ خاندان کے دلوں میں پڑی تھیں وہ کبھی نہ کھُل سکیں نتیجہ یہ ہوا کہ شرافت خاں کی آنکھ بند ہوتے ہی دور قریب کے درجنوں رشتے دار حقِ وراثت کا جھنڈا لہراتے بڑی حویلی پر چڑھ دوڑے۔ مہرُو کی پُشت تو پہلے ہی کمزور تھی۔ اس کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کسی کو مہرُو اور اس کے معصوم بیٹے کے حقوق کا خیال نہ آیا اور وہ شہاب کا ہاتھ تھام کر حویلی سے خالی ہاتھ نکل آئی۔

شرافت خاں کے دل پر راج کرنے والی مہرُ و اب ایک گھریلو ملازمہ تھی۔ اور ننھا شہاب زندگی کے اتار چڑھاؤ سے یکسر لاعلم تھا۔ اس کے لئے تو ماں کی آغوش ہی بہترین پناہ گاہ تھی۔ اور زندگی کا سارا سُکھ اسے ماں کے آنچل کی چھاؤں میں ملتا تھا۔ مہرُ و گھر کا کام کرتی رہتی اور وہ یہاں وہاں رُلتا رہتا۔ اتنے بڑے سرکاری افسر کے بچے بھلا اس کی کیا پرواہ کرتے۔ ان کے لئے اپنی ہی مصروفیات کیا کم تھیں — سرکاری ملازم چوبیس گھنٹے ان کی خدمت میں حاضر رہتے اور ان کے کھیل بھی اتنے معیاری ہوتے تھے کہ نوکروں کے بچوں کی ان تک رسائی ہی ناممکن تھی۔ ٹینس، بیڈمنٹن، کرکٹ، ویڈیو گیمز اور کمپیوٹر سے جی بہلانے والے بچوں کو شہاب خاں کی بھلا کیا پرواہ ہوتی۔ سو وہ یوں ہی رُلتے، رُلتے بڑا ہوتا گیا۔ اب تو وہ بھی گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنے لگا تھا — اسے کام کرتے دیکھ کر مہرُ و کا جی بہت کُڑھتا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ اس نے بھی کب سوچا تھا کہ شرافت خاں کا اکلوتا بیٹا اس طرح دوسروں کی چاکری کرے گا — ؟

جس دن پہلی بار مالک کے گھر میں شہاب کو 'چھوٹو' کہہ کر پکارا گیا۔ اس روز پہلی بار مہرُ و کے دل میں ننھی سی ایک کرچ پیوست ہوگئی۔ اور اس روز شرافت خاں اسے بہت یاد آئے۔ شہاب نے ماں سے سخت احتجاج کیا بسور کر کہا۔

''ماں! میرا نام چھوٹو نہیں ہے'' —

اپنے پٹھانی خون اور خاندانی شرافت پر یہ وار محسوس کرنے کے لئے اس کی عمر بہت کم تھی۔ لیکن خون تو ہر عمر میں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ اس کے احتجاج پر مہرُ و نے اسے اپنے کلیجے میں بھر لیا — اور اس کی دلدہی کرنے لگی۔

''ہاں میرے چاند تیرا نام چھوٹو نہیں ہے۔ تو تو شہاب خاں ولدِ شرافت خاں ہے۔ لیکن ان لوگوں کو پتہ نہیں ہے'' —

معصوم بچہ وقتی طور پر بہل گیا — پٹھانی نقش و نگار والا یہ سُرخ و سفید بچہ کہیں سے چھوٹو نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مالک کے کالے اور سانولے بچے کہیں زیادہ بدصورت تھے۔ لیکن انھیں چھوٹو کہنے کی جرأت کون کرسکتا تھا — کیونکہ وہ ایک بڑے سرکاری

افسر کے جگر گوشے تھے۔اور شہاب ایک معمولی ملازمہ کا لڑکا تھا— حالانکہ مہرو نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اس کے جگر کا ٹکڑا—اور شرافت خاں رئیس کا اکلوتا وارث چھوٹو بن جائے گا—اسی دن مہرو نے فیصلہ کیا کہ وہ پڑھا لکھا کر شہاب کو بڑا آدمی بنائے گی اگر وہ اپنے باپ کی طرح رئیس نہ بنا تو نہ سہی۔کم از کم شہاب خاں تو بن ہی جائے گا——— اور اس نے تیری میری خوشامد کر کے شہاب کا داخلہ ایک قریبی اسکول میں کرا دیا۔وہ بھی اپنا چھوٹا سا بستہ لے کر ہنسی خوشی اسکول جانے لگا۔اس کے لئے سب سے حسین لمحہ وہ ہوتا تھا جب ماسٹر صاحب حاضری لیتے وقت اس کا نام پکارتے تھے—

''شہاب خاں''—

''حاضر جناب'' وہ بڑی مستعدی سے جواب دیتا تھا۔چند مہینے ہنسی خوشی بیت گئے۔لیکن پھر نہ جانے کب——— کیسے؟ دبے پاؤں 'چھوٹو' وہاں آگیا— اور بچے اسے چھوٹو کہہ کر پکارنے لگے۔شہاب چھوٹو کہنے پر کسی کا بستہ پھینک دیتا۔کسی کی کتاب، کاپی پھاڑ دیتا— اور ایک بار تو اس نے ایک لڑکے کا سر ہی پھاڑ دیا— اس دن اس کی شکایت ماسٹر صاحب تک پہنچ گئی۔ماسٹر صاحب نے اسے بری طرح پیٹا— اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر تیرا نام چھوٹو ہے تو برا کیوں مانتا ہے۔ماسٹر صاحب کے سامنے تو وہ کچھ نہیں بولا— لیکن اگلے دن وہ اسکول نہیں گیا— اور جب لگاتار کئی روز اس نے اسکول کی ناغہ کی تو مہرو نے ڈانٹا—

''تو اسکول کیوں نہیں جا رہا ہے؟''—

''میں اب کبھی اسکول نہیں جاؤں گا'' شہاب نے دھیرے سے کہا—

''کیوں نہیں جائے گا؟''—

وہ اسے کوئی وجہ نہیں بتا سکا—

''بس نہیں جاؤں گا'' اس نے سختی سے انکار کر دیا۔شاید وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ جب چھوٹو ہی رہنا ہے تو اسکول جا کر مغز پچی کرنے سے کیا فائدہ؟—

اس کی ضد کے سامنے مہرو بھی مجبور ہو گئی۔زندگی کی اوبڑ کھابڑ راہوں پر مہرو زیادہ

دن شہاب کا ساتھ نہ دے سکی۔ ماں کی آنکھ بند ہونے کے بعد بھی وہ افسر صاحب کے گھر میں رہنے پر مجبور تھا—اس گھر سے باہر کی دنیا اب بھی اس کے لئے اجنبی تھی— حالانکہ وہ یہاں ذرا بھی خوش نہیں تھا—— چھوٹو کے نام کا ہتھوڑا دن رات اس کے دماغ پر چوٹ لگاتا تھا۔ اور صبح سے شام تک اس کے نام کی پکار پڑتی تھی۔

''چھوٹو— جوتے پالش کردو''

''چھوٹو—بازار سے سبزی لادے''

''چھوٹو— کپڑے استری کرنا ہیں''

''چھوٹو— چھوٹو''—اور چھوٹو— ہر آواز پر اندر باہر دوڑتا رہتا تھا—اسے کام کرنا برا نہیں لگتا تھا—بس اسے اس نام سے چڑ تھی— پھر اب تو وہ دیکھنے میں بھی کہیں سے چھوٹو نہیں لگتا تھا—اچھے قد کاٹھ کا نوجوان تھا۔لیکن یہ ہٹا کٹا نوجوان کسی کو نظر نہیں آتا تھا— نظر آتا تھا تو بس چھوٹو—

وقت کے ساتھ ساتھ اس کا احتجاج بھی بڑھتا جارہا تھا۔ مالکوں سے اس کا بس نہیں چلتا تھا البتہ ملازموں سے اس کی اکثر جھڑپ ہو جاتی تھی۔اور وہ دوسرے تیسرے دن ان سے اُلجھ پڑتا تھا—ایک دن حمو خالہ نے اسے پیار سے سمجھایا—

''بیٹا! تو کیوں سب سے جھگڑا مول لیتا ہے۔آخر اس نام میں کیا برائی ہے؟''—

''برائی ہی برائی ہے'' کیونکہ میرا نام چھوٹو نہیں شہاب ہے۔اس نے اکھڑ لہجہ میں کہا—

''بچپن سے سب لوگ تجھے اسی نام سے پکارتے آرہے ہیں پھر اب اتنا غصہ کیوں کرتا ہے؟''—

''کیونکہ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔بچہ نہیں ہوں''—

''بس عادت جو ہوگئی ہے سب کو''

حمو خالہ نے ٹالنے کی کوشش کی۔لیکن وہ ہتھے سے اُکھڑ گیا۔''یہ تو کوئی بات نہیں

ہے خالہ۔ سب کو معلوم ہے کہ میرا نام شہاب ہے۔۔۔ پھر بھی جان بوجھ کر یہ لوگ مجھے چڑاتے ہیں''اس کی آواز بھرّا گئی۔۔۔

''بیٹا شروع سے جو نام زبان پر چڑھ جاتا ہے وہی ہمیشہ پکارا جاتا ہے۔ اصل میں یہ جو مالک لوگ ہوتے ہیں نا! انہیں ہمارا نام بگاڑنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو۔۔۔ میرا اچھا بھلا نام حمیدہ تھا۔ لیکن انھوں نے حمّو کر دیا۔۔۔ ذرا سا جی بہلانے کے لئے آگے خالہ کا دُم چھلاّ لگا دیا۔۔۔ اب تو میں خود بھی اپنا نام بھول چکی ہوں۔''۔۔۔

خالہ نے ٹھنڈی سانس لی۔۔۔

''۔۔۔ لیکن میں اپنا نام کبھی نہیں بھول سکتا۔۔۔''

شہاب نے ٹھوس لہجہ میں کہا۔۔۔ تو حمّو خالہ ہنس دیں اور وہ جھلاّیا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے حمّو خالہ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔۔۔ ماں کے بعد وہی اس کا خیال رکھتی تھیں لیکن نام کے معاملہ میں وہ ان کی بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔۔۔ اور جب ایک دن مالی بابا کے ٹانگ برابر چھوکرے نے چھوٹو کہہ کر دس لوگوں کے سامنے اسے پکارا تو اس نے اسی دن گھر چھوڑ دیا۔۔۔ اور دوسرے محلّے میں کرائے کی کوٹھری لے کر رہنے لگا۔۔۔ جلدی ہی اسے ویلڈنگ کرنے کا کام بھی مل گیا۔۔۔ یہاں وہ بہت خوش تھا۔۔۔ سارا دن وہ دوکان پر جی توڑ کر محنت کرتا تھا۔۔۔ اور رات میں آرام سے سوتا تھا۔۔۔ صبح سے شام تک شہاب۔۔۔ شہاب خاں۔۔۔ شہاب بھائی کی آوازیں کانوں میں رس گھولتی تھیں۔۔۔ اور یہ شہد ٹپکاتی آوازیں سن کر اس کے بدن میں بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔۔۔ پھر تو استاد چاہے اس سے دس آدمیوں کا کام کروا لے۔۔۔ نہ وہ انکار کرتا تھا۔ نہ ہی کام میں سُستی کرتا تھا۔۔۔ زندگی کی سچّی خوشی تو اسے اب ملی تھی۔۔۔ اپنے اصلی نام کے ساتھ جینے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔۔۔

شہاب آڈر کا گیٹ بنانے کے لئے سریاں اور پٹیاں چھانٹ کر الگ رکھ رہا تھا کہ ''ارے چھوٹو تم'' کی آواز سن کر اچھل پڑا۔۔۔ اور اس کے ہاتھ سے سریا چھوٹ گئی۔ پاؤں کے زخمی انگوٹھے کی تکلیف بھول کر اس نے سر اٹھایا۔ غفورے ڈرائیور کھیسیں نکالے سامنے کھڑا تھا۔۔۔ جی میں آیا کہ یہی سریا اٹھا کر اس کے سیاہ تھوبڑے پر کس کر جما دے۔ وہ دانت

پیس کر بولا—

''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ جا کر اپنا چھکڑا سنبھالو''—

''اچ— چھا— تو تمہارا نام چھوٹو ہے؟''—

چھوٹے مستری تو اس سے شروع دن سے اپنے دل میں بیر رکھتا تھا— جیسے جیسے بڑے مستری کی اس کے اوپر نظر عنایت بڑھ رہی تھی— اس کے دل کا بیر بھی بڑھتا جا رہا تھا— اب اسے شہاب سے بدلہ لینے کا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا— اور اس نے ساتھ کام کرنے والے سب لڑکوں کو بتا دیا تھا کہ اس کا نام چھوٹو ہے اور وہ جان بوجھ کر اسے اس نام سے پکارتا تھا۔ شہاب نے کئی بار اسے منع کیا لیکن اس کے منع کرنے کے باوجود چھوٹے مستری نے گویا ضِد پکڑ لی اور وہ اس کے لہجہ میں چھپی ہوئی حقارت اور تذلیل کو برداشت نہ کر سکا۔

''استاد! میرا حساب کر دیں۔ میں اب یہاں کام نہیں کروں گا۔ شہاب سُرخ چہرہ لئے بڑے مستری کے سامنے کھڑا تھا— ذرا دیر پہلے ہی چھوٹے مستری سے اس کی جھڑپ ہو چکی تھی— اور وہ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا—

''یہ آخر تجھے کیا ہو گیا—؟ کیوں خفا ہے؟''—

''کچھ نہیں استاد— بس ایسے ہی''—

وہ انھیں کیسے سمجھاتا کہ وہ کیوں جانا چاہتا ہے۔ اور وہ سمجھتے بھی کیوں؟۔

''میں بتاتا ہوں استاد——'' چھوٹے مستری نے مسکرا کر کہا— تو شہاب نے ہتھوڑا اٹھا لیا— وہ اس کے تیور دیکھ کر چپ ہو گیا۔ پھر جب استاد کو اس کی ناراضگی کا سبب معلوم ہوا تو انہوں نے چھوٹے مستری کو خوب ڈانٹا— کام سے نکالنے کی دھمکی بھی دے ڈالی۔ لیکن شہاب کسی صورت وہاں کام کرنے پر تیار نہیں ہوا۔

شہاب نے چھوٹو کی لعش اسی شہر میں دفن کر دی۔ اور ایک نئے شہر کی راہ لی۔ پرانے شہر میں تو ہر وقت یہ خوف اس پر مسلّط رہتا تھا کہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے 'وہ' اس کے سامنے۔ اس کے پاس نہ چلا آئے۔ یہ نام چوٹ کھائے ہوئے دشمن کی طرح اس کا تعاقب کرتا ہوا ہر جگہ پہنچ جاتا تھا— وہ اس سے چھپ کر ایک دور افتادہ شہر میں نئے سرے سے

زندگی شروع کرنے کا عزم لے کر وارد ہوا تھا۔۔۔ شہر بھی اتنا بڑا تھا کہ ایک سرے پر آگ لگتی تو دوسرے سرے تک اس کا دھواں نہیں پہنچتا تھا۔۔۔ پھر اس کا وہ منحوس لعنتی نام۔ یہاں تک کیسے پہنچ سکتا تھا۔ یہاں تو انسان خود کو بھی بھولے رہتا تھا۔ صبح سے شام تک بھاگم بھاگ لگی رہتی تھی۔ ایسے میں کسی کو کیا پڑی تھی کہ دوسروں کی ذات پات۔ حسب نسب یا نئے پرانے نام کے چکروں میں پڑتا۔۔۔ یہ شہر اس کو راس آ گیا تھا۔ خاص طور پر وہ بستی جہاں اس نے ایک جھگی کرائے پر لے کر رہائش اختیار کی تھی۔۔۔ اس بستی کے لوگ بہت سادہ مزاج تھے۔۔۔ محنت مزدوری کر کے اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالنا ہی ان کا ایمان اور دھرم تھا۔۔۔ ان کے ہاں ماضی کا ماتم کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔۔۔ وہ اپنا گاؤں، مکان، خاندان سب کچھ چھوڑ کر روزی کے چکر میں یہاں آئے تھے۔۔۔ اور جو کچھ چھوڑ کر آئے تھے۔۔۔ برا یا بھلا، اسے وہ بھول چکے تھے ۔۔۔ وہ تو بس 'حال' میں جینے والے لوگ تھے۔۔۔ اپنے کام سے تھکے ہارے آتے اور اگلے دن کا تردد لے کر سو رہتے۔ صبح جاگتے تو 'آج' کی فکر دامن گیر ہوتی۔۔۔ اور محنت کش باز واپنے خاندان کے لئے دو وقت کی روٹی جٹانے میں لگ جاتے تھے۔۔۔ ان کی فکریں محدود تھیں۔۔۔ لیکن مسائل بے شمار تھے۔۔۔ بچوں کی بیماری بیوی کی زچگی۔ بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ۔۔۔ ایسے میں شہاب کے بارے میں سوچنے کی کسے فرصت تھی۔۔۔؟

رمضان خاں اس کے پڑوسی تھے۔ اور ایک جوان بیٹی کے باپ بھی۔۔۔ انہیں یہ محنتی اور ایماندار نوجوان شروع دن سے پسند تھا۔۔۔ پھر تندرست اور گورا چٹا بھی تھا۔۔۔ اس کے مقابلہ میں شبو کے پاس جوانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔۔۔ لیکن ایک باپ کے لئے بیٹی کی جوانی اثاثہ نہیں بوجھ ہوتی ہے۔ اور وہ اس بوجھ کو اتارنے کی فکر میں کبھی کبھی تو اچھا برا بھی نہیں سوچتا۔ جبکہ شہاب میں تو کوئی برائی بھی نہیں تھی۔۔۔ ایک دن رمضان خاں نے اس سے بڑی اپنائیت سے کہا۔۔۔

شہاب بیٹا۔۔۔ اس طرح کب تک اکیلے رہو گے؟"۔۔۔

"اکیلا کہاں ہوں۔۔۔ آپ سب ہیں نا؟"۔۔۔

چھوٹو سے نفرت کرتے کرتے وہ زندگی کے فطری تقاضوں کو بھی فراموش کر گیا

تھا— اس لئے رمضان کا اشارہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا— رمضان خاں نے اسے اس کی سادہ لوحی سمجھا— ''بیٹا! یہ بھی کوئی زندگی ہے— سارا دن محنت کرو— اور رات کو چارپائی پکڑ لو— پھر ہوٹل کی روٹی کھا کھا کر بیمار ہو جاؤ— میری مانو تو اپنا گھر بسا لو''—

''یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں''

شہاب نے شرما کر کہا— رمضان خاں ہنسنے لگے—

پہلے نہیں سوچا تو اب سوچ لو۔ جب تک دُکھ سُکھ کا کوئی ساتھی نہ ہو— آدمی جانور کی طرح جیتا ہے۔ بس دو وقت پیٹ بھر لیا— اور سمجھ لیا یہی زندگی ہے۔ خاندان کے بغیر جینا بھی کوئی جینا ہے— بیٹا تم شادی کر لو''—

''چچا— یہ سب تو بڑوں کا کام ہوتا ہے۔ میرا کون ہے جو شادی بیاہ کا سوچے گا''—

شہاب نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔ رمضان خاں ہنسنے لگے۔ ''میں بھی تو تمہارا بزرگ ہوں۔ اگر تم راضی ہو تو بتاؤ رشتہ ہونا کیا مشکل ہے۔؟''—

''آپ کو اختیار ہے چچا'' شہاب نے رضامندی دے دی—

''تم نے شبّو کو دیکھا ہے؟''— انہوں نے پوچھا—

''جی— دیکھا تو ہے'' شہاب ٹپٹا گیا۔ اب یہ کیسے کہتا کہ اس خیال سے کبھی نہیں دیکھا—

''گھر کے کام کاج میں بہت ہوشیار ہے میری بیٹی۔ نہیں اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی''—

ایک سانولی سلونی، گداز بدن کی پرکشش لڑکی چھم سے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ اور وہ خود سے بھی شرما گیا۔ عجیب بات تھی کہ اس نے شبّو کو کبھی جوان مرد کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا— ورنہ وہ تو بار بار دیکھنے کے قابل تھی— اس رات اپنی جھگی میں تنہا لیٹے ہوئے اسے شبّو کے خیال نے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ ذرا سی آنکھ لگتی تو اس کا رنگین آنچل بند پلکوں کے عقب میں لہرانے لگتا۔ اور اس کی شوخ ہنسی دل میں ہلچل مچا دیتی۔ اور ایک دن وہ

پائل چھنکاتی — چوڑیاں کھنکاتی اس کی جھگی میں دلہن بن کر آ گئی

شہاب اسے پا کر بہت خوش تھا— اور شبّو جو اس کی مردانہ وجاہت سے پہلے ہی مرعوب رہتی تھی — اور زیادہ اسے چاہنے لگی۔ اس بستی کا ہر مرد جوان لڑکیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے تاکتا تھا— شہاب نے کبھی کسی لڑکی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ شبّو اور دوسری لڑکیاں سمجھتی تھیں کہ اسے اپنے رنگ روپ اور قد کاٹھ پر گھمنڈ ہے۔ لیکن قریب آنے پر پتہ چلا کہ اس کا خیال غلط ہے۔ وہ تو بچوں کی طرح معصوم اور سادہ لوح تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو اس کی جیسی کالی کلوٹی کو کیوں اتنا چاہتا— بلکہ شادی ہی کیوں کرتا؟

شبّو کا پاؤں بھاری ہوا تو شہاب کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا— لیکن فکر مند بھی ہو گیا—

''کیا بات ہے۔ آپ چپ کیوں ہو گئے؟''—

''شبّو — سوچ رہا ہوں کہ میرا بچہ اس جھگی میں کیسے رہے گا؟'' اس نے دھیرے سے کہا—

''جیسے ہم رہتے ہیں۔ ویسے ہی وہ بھی رہے گا''— اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟'' شبّو کو ہنسی آ گئی۔

''ہماری اور بات ہے۔ لیکن وہ صرف ہمارا بیٹا ہی نہیں ہوگا شرافت خاں رئیس کا پوتا بھی ہوگا''—

''شرافت خاں رئیس سے ہمارا کیا واسطہ''؟—

وہ اس کی بات خاک نہیں سمجھی— لیکن شہاب خاں اس سچائی کو کبھی نہ بھول سکا—

''یہ تم نہیں سمجھوگی۔ میں آج ہی کرائے کے مکان کا بندوبست کرتا ہوں''— اس نے فیصلہ سنا دیا—

شبّو کا باپ کیا۔ اس کا دادا بھی اس بستی میں رہتا تھا— اور اس کی ساری اولادیں یہیں پیدا ہوئی یہیں اس بستی میں پلی بڑھیں— اور سب کا شادی بیاہ بھی یہیں ہوا— اس بستی سے کہیں اور جانے کا تو کسی نے سوچا بھی نہیں تھا— کبھی شہر میں جانا ہوتا تو وہ اونچی

اونچی بلڈنگوں اور مکانوں کو اس طرح دیکھتی جیسے بچے چاند کو دیکھتے ہیں۔ اب شہاب مکان میں رہنے کے خواب دیکھ رہا تھا— لیکن اس کا یہ خواب ایک دن سچ ہو گیا— اور شہاب نے ایک پرانے محلے میں چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا— جھگی میں آنکھ کھولنے والی شبّو کے لئے ایک کمرہ کا یہ گھر کسی محل سے کم نہیں تھا— بجلی اور نل کی بھی سہولت تھی— سب سے بڑھ کر خوشی اسے بیت الخلاء دیکھ کر ہوئی تھی— خدا کا شکر تھا کہ بستی کے گندے بم پُلس سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں چلتے پھرتے وہ خود کو کہیں کی مہارانی سمجھتی تھی—

گھر کے قریب والے زنانہ اسپتال میں اس نے ایک تندرست اور خوبصورت بیٹے کو جنم دیا— وہ خوش تھی کہ بچہ شہاب کی طرح گورا چٹا ہے۔ خوش تو شہاب بھی تھا— اس نے پرانی بستی جا کر سب کو لڈو بانٹے— اپنے محلّے والوں کو بھی مٹھائی کھلائی۔ جس دن شبّو گھر آکر چھٹی کا نہان نہائی اس دن شہاب نے بیٹے کا نام آفتاب خاں رکھ دیا— اور شبّو کو تاکید کر دی کہ وہ اسے آفتاب کے علاوہ کسی اور نام سے نہ پکارے نہ ہی پیار کے الٹے سیدھے نام رکھے— اس کی بات سن کر شبّو خوب ہنسی—

''اور یہ جو بڑے لوگ اپنے بچوں کے پیار کے نام رکھتے ہیں۔ کیا سب بُرا کرتے ہیں؟ — پڑوس کے وکیل صاحب گپتا جی۔ مائیکل انکل سب نے اپنے بچوں کے کیسے پیارے پیارے نام رکھے ہیں۔ بنٹی۔ ببلو۔ پنکی۔ نکّی۔ شُوشُو وغیرہ'' —

''وہ بڑے لوگ ہیں۔ اپنے بچوں کا جو چاہے نام رکھیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ غریبوں کے بچوں کا نام بگڑتا ہے تو گالی بن جاتا ہے۔''

شہاب بہت سنجیدہ تھا۔ شبّو کی موٹی عقل میں اس کی فلسفیانہ بات بھلا کیا آتی۔ وہ ہنس کر چُپ ہو گئی۔ اس نے پہلے بھی کب اس سے بحث کی تھی جواب کرتی— پھر آفتاب تو پورا کا پورا اپنے باپ کا بیٹا تھا۔ اس کی تو پرچھائیں تک اس پر نہیں پڑی تھی— وہ تو یوں بھی اس کی آیا لگتی تھی— پھر بھلا حق کیا جماتی۔ اس کے لئے تو۔ یہی بہت تھا کہ شہاب جیسا شہزادہ اسے بہت چاہتا تھا— اور اب یہ ننھا شہزادہ بھی کسی سے کم نہیں تھا۔

یوں تو پورا ہفتہ شہاب جی جان سے محنت کرتا تھا۔ اُوور ٹائم بھی کرتا تھا۔ لیکن چھٹی کے دن وہ سارا وقت شبّو اور آفتاب کے ساتھ گزارتا تھا — وہ دونوں کو باہر گھمانے لے جاتا۔ کبھی پارک، کبھی چڑیا گھر۔ کبھی شاپنگ اور کچھ نہیں تو چاٹ اور آئس کریم ہی کھانے نکل جاتے۔ آفتاب باہر بہت خوش رہتا تھا — ہنستا کھیلتا غبارے کی طرف لپکتا — کبھی کسی کھلونے کو دیکھ کر مچل جاتا اور اس کی ہر ہر ادا پر ماں باپ خوشی سے نہال ہو جاتے —

اس روز بھی شہاب کی چھٹی تھی — وہ سو کر دیر سے اٹھا۔ اور سارے دن کا پروگرام شبّو کو بتا دیا —

''ناشتہ کر کے ہم گھر سے نکل جائیں گے۔ پہلے چڑیا گھر چلیں گے پھر چھولے بھٹورے کھائیں گے — آفتاب کے لئے چاکلیٹ لیں گے — اسے آئس کریم کھلائیں گے — اور آج اس کے لئے بیٹری سے چلنے والی موٹر بھی لینا ہے۔ رات کے لئے کباب پراٹھے پیک کرا لیں گے — آفتاب کا جیم اور بسکٹ بھی ختم ہو گئے ہیں — وہ لینا مت بھولنا — اور جس چیز کی ضرورت ہو یاد کر لو'' —

''جو جی چاہے کرنا — جو جی میں آئے لینا — تمہاری ساری رام کہانی میرے پلّے تو پڑی نہیں — جانے کیسے اتنی باتیں سوچ لیتے ہو۔''

شبّو آفتاب کو ناشتہ کرانے لگی اور شہاب نہانے چلا گیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر شبّو نے آفتاب کو نہلا دھلا کر تیار کیا۔ اور یاد کر کے اس کی پیشانی پر داہنی طرف نظر کا ٹیکہ بھی لگا دیا۔ باہر جتنے لوگ اتنی نظریں — اللہ پاک اس کے بیٹے کو بُری نظر سے بچائے۔ ماشاءاللہ لال، لال سوٹ میں کیسا پیارا لگ رہا ہے''

شبّو نے اس کی بلائیں لیں۔ اور اسے شہاب کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی —

''لو تم ذرا چھوٹو کو سنبھالو — میں بھی تیار ہو جاؤں''

''چھوٹو؟'' — شہاب کے کانوں میں جنگی جہازوں کا پورا قافلہ پُرشور آوازوں کے ساتھ گھُس گیا۔ شائیں شائیں —— دھاڑ — دھاڑ — وہی تلاطم، وہی بھیانک آوازیں — وہی طوفان — وہی گھن گرج —

اس نے آفتاب کو پلنگ پر بٹھایا اور لپک کر شبّو کی گردن دونوں ہاتھوں سے تھام لی۔۔۔ غصے سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ دھاڑ رہا تھا۔۔۔

''ذلیل۔۔۔ کمینی۔۔۔ الو کی پٹھی۔۔۔ تو نے میرے بیٹے کو گالی دی۔۔۔ تو نے اسے چھوٹو کہا۔۔۔ بول۔۔۔ تو نے اسے۔۔۔۔''

۔۔۔ اور پھر اس نے شبّو کو دُھن کر رکھ دیا۔ جب تک پڑوسی آ کر بچائیں، شبّو بے ہوش ہو چکی تھی۔۔۔ اور آفتاب کی ایک چیخ زمین ایک چیخ آسمان پر تھی۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر بات کیا ہے۔ اس سے پہلے تو کبھی اس گھر سے اونچی آواز نہیں سنائی دی تھی۔۔۔ نا کہ ایسی مار پیٹ کہ غریب لڑکی مار کھا کھا کر بے ہوش ہو گئی تھی۔۔۔ ایک عورت نے روتے بلکتے آفتاب کو گود میں لے کر بہلایا۔۔۔ دوسری شبّو کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ہوش میں آئی بھی تو یہ نہ بتا سکی کہ ہوا کیا تھا۔ اس کی تو خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آخر اس نے ایسا کیا کہہ دیا تھا جو شہاب نے مار مار کر اسے ادھ مرا کر دیا۔۔۔ اور جسے جواب دینا تھا وہ تو کبھی کا گھر کے باہر جا چکا تھا۔۔۔

آدھی رات کو شہاب گھر میں داخل ہوا آفتاب شبّو کے پہلو میں سو رہا تھا۔۔۔ اور شبّو اپنے سانولے بدن اور نمکین چہرہ پر اس کے ظلم و جنون کے نشان سجائے سو رہی تھی۔ اس نے سوئی ہوئی شبّو کے سینے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔۔

☆☆

کہاں کا عشق!!

''جگنو میاں بتول کے عشق میں پاگل ہو رہے تھے۔'' ''جگنو میاں زہر کھانے کے لئے تیار ہیں''۔

''جگنو میاں اٹوائی کھٹوائی لئے پڑے ہیں''۔

خاندان میں ہر طرف جگنو میاں کے عشق کے چرچے تھے۔ اگر جگنو میاں عشق کر رہے تھے تو اس میں حیرت کی کیا بات تھی۔ عشق کرنا تو مردوں کا پیدائشی حق ہے وہ مرد بیوقوف ہوتے ہیں جو اپنے حق سے کبھی ہنسی خوشی اور کبھی مجبوراً دست بردار ہو جاتے ہیں۔ اور ساری عمر اپنی حماقت پر پچھتاتے ہیں۔ عقل مند مرد وہ ہے جو بار بار۔ بلکہ ہزار بار اپنے حق کا استعمال کرے اور ڈنکے کی چوٹ پر ہر نئے عشق کا اعلان کرے۔

جگنو میاں کا بھی یہ پہلا عشق نہیں تھا۔ وہ اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے۔ اور بہتوں نے تو انہیں سے عشق کا سبق سیکھا تھا۔ ضویا سے انہوں نے بڑا زناٹے دار عشق کیا تھا۔ اور اپنی بات منوانے کے لئے زمین آسمان ایک کر دیا تھا۔ ان کی بس ایک ہی رٹ تھی کہ شادی کریں گے تو ضویا سے ورنہ ساری عمر کنوارے رہیں گے۔ ان کی اماں بھی ایک ہی ضدی تھیں بیٹے کی واویلا کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور صاف کہہ دیا۔

''بیٹا بھنگن لاؤ۔ چمارن لاؤ۔ لنگڑی، لولی، اندھی، اور کانی لے آؤ۔ ہم ہنسی خوشی اسے دلہن بنا کر اپنے آنگن میں اتاریں گے۔ لیکن ضویا کو اپنے گھر کی بہو ہرگز نہیں بنائیں گے

جگنو میاں ایک تو اکلوتے۔ اوپر سے سر پھرے بھی۔۔۔ ساری محبت اور سعادت مندی کنارے رکھ کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''اگر ضویا سے شادی نہیں ہوئی تو زہر کھالیں گے''۔۔۔

اماں نے کہا۔

''زہر کھائیں تمہارے دشمن۔ میں جنم جلی، نصیبوں کی ماری خود ہی جان دے دوں گی۔ شوق سے بیاہ رچاؤ۔ کم از کم اپنی آنکھوں سے دشمن کی اولاد کو چھاتی پر مونگ دلتے تو نہیں دیکھوں گی۔

جب ماں، بیٹا دونوں جان دینے پر آمادہ ہو گئے تو خاندان بھر کے لڑکے اور لڑکیاں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔۔۔

''آخر اس بات کا فیصلہ کیسے ہو گا کہ دونوں میں سے کون جان دے گا؟''۔۔۔

کسی شریر لڑکے نے جھٹ جیب سے ایک روپے کا سکہ نکالا۔۔۔ ''لو ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے۔ بولو سن یا پتلی؟'' سَن پتلی کے شور میں فیصلہ اماں کے حق میں ہو گیا۔ اور سب نے چین کی سانس لی۔

''اب جگنوں میاں ٹھاٹ سے ضویا کے ساتھ بیاہ رچائیں اماں تو گئیں کام سے''۔۔۔

اماں نے اُڑتی پڑتی اپنے مرنے کی خبر سُنی تو اُچھل پڑیں۔ ''مریں میرے دشمن! یہ کون خدائی خوار، موت پیٹا میری موت کا فرمان جاری کر رہا ہے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں اس ناس پیٹے سورما کی شکل۔۔۔ لو ایک روپے والا ِگلٹ کا سکہ اُچھال کر سن پُتلی کھیلا جا رہا ہے۔ اور کھیل کھیل میں مجھے عدم آباد کا راستہ دکھایا جا رہا ہے''۔۔۔

اب کوئی ایک سُورما ہوتا تو اسے ان کے حضور حاضر کر دیا جاتا۔ یہاں تو ڈھائی درجن سورما تھے۔ سب ہی نے باری باری سن پُتلی کھیلا تھا۔۔۔ اور ہر بار موت کا قرعہ اماں کے نام نکلا تھا۔۔۔ یا یوں کہیں نکالا تھا۔۔۔

ضویا کوئی غیر نہیں۔۔۔ جگنو کے سگے چچا کی لڑکی تھی۔ اس میں کوئی عیب بھی نہیں تھا۔ صورت شکل ہزاروں میں ایک تھی۔ تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند تھی۔ اگر کوئی عیب تھا تو جٹھائی

دیورانی کے کٹیلے رشتے میں تھا۔ جگنو کی اماں زبیدہ بیگم معمولی صورت شکل کی عام سی خاتون تھیں لیکن ان کے دولت مند والدین نے بیٹی کی بدصورتی کا عیب ڈھانکنے کے لئے دو ٹرک جہیز دیا تھا۔ جس میں چاندی کے پایوں والا پلنگ تک شامل تھا۔ نکہت کی خوبصورتی کو کسی رشوت یا سفارش کی ضرورت نہیں تھی — اور وہ اکہرا، اکہرا زیور اور گیارہ جوڑے لے کر سُسرال آئی تھیں۔ اور اپنے حسنِ اخلاق، شائستگی اور سلیقے سے سب کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا — زبیدہ بیگم ان کا تو کچھ بگاڑ نہ سکیں۔ لڑ جھگڑ کر الگ رہنے لگیں۔ یہ الگ رہنا بھی ایسا ہی تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین بھی نہیں آتا تھا — اِدھر جٹھانی، اُدھر دیورانی بیچ میں نَو انچ کی پتلی سی دیوار کہ اُدھر کسی کو چھینک آتی تو اِدھر کوئی کہہ اٹھتا ''شکر اللہ'' —

زبیدہ بیگم کی سخت تاکید تھی کہ جگنو میاں اور یاسمین چچی کی طرف نہ جائیں۔ یاسمین بے چاری تو ماں کی عقابی نظروں کی تاب نہ لا کر گھر ہی میں دبکی رہتی — لیکن جگنو میاں نے تو گویا ماں کی بات نہ ماننے کی قسم کھا رکھی تھی۔ بہانے بہانے سے دس چکر ضویا کی طرف کے لگاتے — اور صبح کا ناشتہ گھر میں کرتے تو دوپہر کو ضویا کی طرف دسترخوان پر نظر آتے — ضویا بھی بڑی اماں کی نظر بچا کر یاسمین کے کمرہ میں گھُس جاتی اور دونوں مل کر تر تراتے حلوے میوے اور مُربّے اڑاتیں —

نکہت دیکھ رہی تھیں کہ جگنو میاں کی متلاشی نظریں ہر دم ضویا کو تلاش کرتی ہیں۔ اور وہ بھی جیسے ان کی منتظر رہتی تھی۔ اپنی بدلتی ہوئی کیفیت سے جگنو میاں خود بھی آگاہ تھے — آنکھیں، آنکھوں میں ڈوب کر دل کا پیغام دینے لگی تھیں اور دھڑکنیں چھاتی کے اندر دھما چوکڑی مچانے لگی تھیں۔ اُن کے آنے اور جانے کا کوئی وقت مقرّر نہیں تھا۔ پھر بھی ضویا کو جیسے الہام ہو جاتا کہ جگنو میاں کس وقت آئیں گے اور جگنو میاں کو ہر آہٹ پر ضویا کا گمان ہوتا —

اِدھر جگنو میاں کو بینک میں ملازمت ملی اُدھر زبیدہ بیگم ان کے لئے چاند چہرہ، ستارہ آنکھوں والی دُلہن تلاش کرنے نکل پڑیں۔ دیوار کے دوسری طرف رہنے والی ضویا انھیں بھلا کیسے نظر آتی۔ جس کے چہرہ پر کئی چاند قربان کیے جاسکتے تھے۔ اور جس کی آنکھوں

کے آگے ستاروں کی چمک بھی ماند پڑ جاتی تھی ــــ

جگنو میاں کو اپنی اماں کی دھاندلی پسند نہ آئی اور انھوں نے بانگِ دہل ضویا سے اپنے عشق کا اعلان کر دیا ــــ زبیدہ بیگم نے ضویا کے نام پر وہ دہائی ڈالی کہ نکہت سن کر پسینے پسینے ہو گئیں۔ اور انھوں نے جگنو میاں کو پیار سے سمجھایا۔

''بیٹا اماں سے ضد کر کے اپنی من مانی کرو گے تو نہ تم خوش رہو گے نہ ضویا سکون سے جی سکے گی۔ بہتر ہے کہ ماں کی خوشی پوری کرو ــــ اور جہاں وہ کہیں شادی کر لو'' ــــ

''ــــ لیکن دُلہن چچی ــــ میں اماں کی خوشی کے لیے اپنی جان تو دینے سے رہا ــــ اور اگر ضویا مجھے نہ ملی تو میں جی نہ سکوں گا'' ــــ

بے چاری نکہت چپ ہو گئیں۔ وہ جگنو میاں کے دل کا حال بھی جانتی تھیں اور بیٹی کے جذبات بھی سمجھتی تھیں ــــ جٹھانی کی سخت مزاجی اور بدزبانی کا سامنا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی ــــ رہی ضویا ــــ تو اسے جگنو میاں پر پورا بھروسہ تھا۔ اس موقع پر خاندان کی بزرگ خواتین آڑے آئیں اور سب نے زبیدہ بیگم کو سمجھا بجھا کر رضا مند کر لیا۔ وہ تو خود بیٹے کی دیوانگی سے سہمی ہوئی تھیں کہ کہیں ضِد بحث میں کچھ کھا نہ لے۔ اور بیوگی کا سہارا بھی چھن جائے ــــ بیچارے میاں زندہ ہوتے تو شاید وہ ان کی ہی کہتے ــــ لیکن اب تو سوائے جگنو میاں کے کوئی اور سہارا بھی نہیں تھا۔ خاندان کے مردوں نے اس معاملے سے خود کو پہلے ہی الگ کر لیا تھا۔ شادی بیاہ کے معاملے میں مرد غریب کو یوں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ ایسے موقع پر اُچھل کود مچانے والے مرد شادی کے بعد بیویوں کے سامنے منہ کھولتے گھبراتے ہیں ــــ اور ایک دن ضویا دلہن بن کر جگنو میاں کے آنگن میں اُتریں تو جیسے ایک ساتھ کئی چاندان کے گھر میں اتر آئے ــــ

جگنو میاں نے جی بھر کے بیوی سے عشق کیا۔ اب تو کسی کا ڈر بھی نہیں تھا۔ میاں اپنی بیوی سے پیار نہ کرے گا تو اور کس سے کرے گا ــــ؟ شروع شروع میں تو اماں بہت جلیں کُڑھیں لیکن پھر بیٹے کے پاگل پن نے انہیں موہ لیا ــــ خاندان والے جگنو میاں اور ضویا کی محبت کی مثالیں دیتے تو اماں کا سینہ گز بھر کا ہو جاتا۔ دس سال کے اندر ضویا چار بچوں کی ماں

بن گئی۔لیکن نہ تو اس کے حسن کا سورج ڈھلا اور نہ ہی جگنو میاں کے پیار میں کوئی کمی آئی۔ جگنو میاں ترقی پا کر بینک میں منیجر ہو گئے تھے۔

ان کے آنے کا وقت ہوتا تو ضویا سج سنور کر میاں کے استقبال کے لئے تیار ہو جاتیں— موسم کے لحاظ سے موتیا، خس یا شمامہ میں مہکتیں۔لمبی سی چوٹی میں بیلے کی کلیوں کی لڑی لپیٹے پان کی لالی سے رچے سُرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے وہ موٹر کے ہارن کے آواز پر دوڑ جاتیں۔جگنو میاں بھی ان کے حسن کو ایسے والہانہ پن سے نہارتے جیسے پہلی بار انھیں دیکھ رہے ہوں۔ایسے میں زبیدہ بیگم بچوں کو سمیٹ کر بیٹھ جاتیں اور بیٹے بہو کو پیار کرنے کا موقع فراہم کرتیں۔ضویا سارا دن گھر داری اور بچوں میں مصروف رہتی لیکن جگنو میاں کے آنے کے بعد وہ صرف ان کی ناز برداریوں میں لگی رہتی اور بچوں کو ساس کے حوالے کر کے کہتی—

''امّاں—وہ آ گئے—اب آپ جانیں اور بچّے''—

زبیدہ بیگم زیرِلب مسکراتیں— جانتی تھیں اب بیٹے اور بہو کا کمرہ صبح تک بند رہے گا''— کبھی موڈ میں ہوتیں تو کہہ دیتیں—

''اُوئی نوج—ایسی بھی محبت کس کام کی۔چار بچّے ہو گئے اور ان کی سہاگ رات ہی ختم نہیں ہوتی''

جگنو میاں شرارت سے ہنس کر کہتے۔

''ضویا جان! تم نے سُنا اماں کیا کہہ رہی ہیں—؟''

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔میرا دل آپ ہی بچّوں میں لگا رہتا ہے۔''

''اچّھا جی—یہ بات ہے؟ خیر تم جاؤ اپنے بچوں کے پاس میں جا رہا ہوں کسی نپٹ کنواری کی تلاش میں''—

''وہ کس لئے؟''—

''اس کے ساتھ بچوں کا دم چھلاّ تو نہیں ہوگا۔ٹھاٹ سے دونوں عشق کریں گے''—

''منہ دھو رکھئے جناب۔ آپ کو میرے سوا اور کوئی نہیں پوچھے گا—'' وہ بڑے غرور سے کہتیں—''

''وہ سلمیٰ ہے نا بیچاری—اب بھی مجھے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے'' جگنوں میاں سینے پر ہاتھ رکھ لیتے—

''نا کہیں— بیچاری دمے کی مریض ہے۔ ہر وقت سانس پھولتی ہے''—اور ثمرہ—؟''—

''غریب پیدائشی بھینگی ہے—دیکھتی کہیں اور ہوگی۔ آپ سمجھتے ہیں نشانے پر آپ ہیں—اُف ری خوش فہمی؟''—

''چلو چھوڑو—ہمیں کسی سے کیا لینا دینا''—

''اتنے مایوس نہ ہوں۔ آپ کہیں تو میں کسی سے سفارش کر دوں؟''

''کر سکو گی؟''—

''کیوں نہیں— کبھی آزما کر دیکھ لیں—''

''کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟''—

''یہ سوال آپ نے کیوں کیا؟ محبت ہے تب ہی تو کہہ رہی ہوں''

''پیار کرنے والے تو جان وار دیتے ہیں''—

''میں بھی تو اپنی جان وارنے کے لئے تیار ہوں— آپ میری جان ہی تو ہیں— اور آپ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا''۔

''میں مر جاؤں تب بھی نہیں—؟''—

''شش— خبردار جو ایسی بات پھر کبھی کہی''—

''نہیں کہوں گی''—

''میں تو خواب و خیال میں بھی کسی اور کے بارے میں نہیں سوچ سکتا— میری محبت کی ابتدا بھی تم ہو اور انتہا بھی تم ہو''—

''چلئے مان گئی۔ اور اب یقین آیا کہ آپ جیسے چاہنے والے ہی تاج محل تعمیر

کرا سکتے ہیں''۔۔

''خیر آج کل کے زمانہ میں تو کوئی تاج محل نہیں بنوا سکتا۔۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ہماری محبت کو کسی تاج محل کی ضرورت نہیں ہے''۔۔

جگنو میاں کی محبت میں گلے، گلے ڈوبی ہوئی ضویا کو پتہ ہی نہیں چلا کہ وقت کیسے گزر گیا۔ بڑی بیٹی ثنا فراک کے بجائے شلوار کرتا پہننے لگی تو احساس ہوا کہ بیٹی جوان ہو گئی ہے۔ دوسری بیٹی حِنا بھی قد نکال رہی تھی۔۔ بیٹے دونوں چھوٹے تھے۔۔ لیکن انھیں بھی بڑا ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔۔

ضویا اپنا زیور نکالے بیٹھی تھی۔۔ اور ساس سے کچھ مشورہ کر رہی تھی۔۔ جگنو میاں نے دو چار ڈبّے اٹھا کر دیکھے۔ پوچھا۔۔

''یہ دوکان کیوں سجا رکھی ہے؟''۔۔

''اماں سے پوچھ رہی تھی اس زیور کے دو حصّے کس طرح کیے جائیں کہ ثنا اور حنا کو شکایت نہ ہو''۔۔

''حصّہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''۔۔

''چار دن کے بعد دونوں کی شادی کرنا ہو گی اس لئے ضرورت ہے''

''ایں شادی؟۔۔ ثنا اور حنا کی شادی؟''۔۔

''شاید آپ نے انھیں نظر بھر کے دیکھا نہیں ہے۔ ماشاءاللہ دونوں آگے پیچھے بیاہنے کے لائق ہیں''۔۔

''واقعی؟۔۔ جھک کر بولے۔ ہمیں تو آپ کے سوا دوسرا کوئی نظر ہی نہیں آتا''۔۔

''جگنو کیا کہہ رہا ہے بیٹی؟''۔

اماں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو ضویا سے پوچھ بیٹھیں۔۔ ''کچھ نہیں اماں۔۔ کہہ رہے ہیں دونوں ابھی بہت چھوٹی ہیں''

''ہونہہ۔ مردان باتوں کو کیا سمجھیں۔ چار دن کے بعد سرو جیسا قد نکل آئے گا لڑکیوں کا۔۔'' اماں نے پتے کی بات کہی۔

''ضویا۔ یہ سب سمیٹ کر رکھ دو — پھر کمرہ میں آنا ایک ضروری کام ہے —''

جگنو میاں نے اپنے کمرہ کی راہ لی —

ضویا نے میاں کو کپڑوں کی الماری میں گھسے دیکھا تو مسکرا دیں۔

''کیا ڈھونڈھ رہے ہیں۔ ساری الماری اُلٹ پلٹ کر ڈالی'' —

''میرے تین چار جوڑے نکال دو۔ کل صبح کی فلائیٹ سے مجھے مدراس جانا ہے۔ بینک کے منیجروں کی کانفرنس ہو رہی ہے'' —

''وہ تو میں نکال دوں گی۔ کتنے دن کے لئے جائیں گے؟'' —

''چار دن تو لگ ہی جائیں گے'' —

''اُف — اتنے دن؟ — ضویا کا جی دھک سے ہو گیا —

''کیا کریں مجبوری ہے۔ میں نے تو لاکھ کوشش کی کہ جان بچ جائے — لیکن —'' جگنو میاں کھسیانی ہنسی ہنس دیئے —

''اتنے دن اکیلی کیسے رہوں گی؟'' —

''میں بھی تو کبھی ایک رات تمھارے بغیر نہیں رہا —''

خاندان میں ان دونوں کا خوب مذاق بنتا تھا۔ شادی بیاہ ہو یا پھر کوئی اور تقریب — میاں بیوی ساتھ جاتے اور ساتھ ہی واپس آجاتے — جگنو میاں ضویا کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے تھے — شادی کے بعد وہ تو میکے میں بھی ایک رات نہیں رکی — یہ تو اچھا تھا کہ میکہ اور سسرال پاس پاس تھے — بلکہ ایک ہی مکان کے دو حصّے تھے — تو بات نبھ گئی۔ ورنہ بڑی مشکل ہوتی۔ اور اب جو میاں کے باہر جانے کی خبر سنی تو ضویا بوکھلا گئی —

''میں کام ختم ہوتے ہی آجاؤں گا'' جگنو میاں نے تسلّی دی —

''آپ میری بیماری کا عذر پیش کر دیتے'' —

''بیمار ہوں تمہارے دشمن — میرے بس میں ہوتا تو اپنا ڈیتھ سرٹیفکیٹ تک پیش کر دیتا'' —

''اللہ نہ کرے — یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' — ضویا نے بُرا مان کر کہا —

اور ٹسر ٹسر رونے لگی — رونا تو پہلے سے آرہا تھا۔ اب تو خاصا مضبوط بہانہ مل گیا تھا رونے کا۔

جگنو میاں بھاری دل سے رخصت ہوئے۔ اور جاتے جاتے بیوی کو ڈھیروں دلاسے دیتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد ضویا کو محسوس ہوا کہ ایک گھر ہی کیا ساری دنیا ویران ہوگئی ہے۔ مدراس پہنچتے ہی جگنو میاں نے ضویا کو فون کیا۔ اور اپنی خیریت بتائی۔ تب کہیں جا کر اسے قرار آیا — قرار بھی کب آیا — خواہ مخواہ رکھی دھری چیزیں اُلٹ پلٹ کرتی رہی — اور بولائی بولائی سارے گھر میں پھرتی رہی — زبیدہ بیگم کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا اپنے پاس بُلا کر بٹھایا — اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر پیار کیا۔

''پگلی — دو ہی دن میں منہ اُتر گیا۔ ٹھیک سے کھاتی پیتی بھی نہیں — جگنو آ کر کیا کہے گا؟'' —

''اماں — کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے'' —

''اسی لئے بڑے بوڑھے کہتے ہیں عورت کو ذرا کھنچ کر رہنا چاہئے — پیار کرے تو اظہار نہ کرے — مرد اور زیادہ مغرور ہو جاتا ہے — ''۔

''وہ ایسے نہیں ہیں اماں'' — اس نے لاڈ سے کہا۔

''جانتی ہوں بیٹی وہ کتنا پاگل ہے۔ بلکہ تم دونوں ہی مجھے پاگل لگتے ہو — لیکن کبھی کبھی میاں بیوی کو الگ بھی رہنا چاہئے — اس طرح قدر اور محبت بڑھتی ہے۔ خدا تم دونوں کو نظرِ بد سے بچائے — جوڑی سلامت رہے'' —

ضویا نے دل میں 'آمین' کہا۔ اور بچوں کے پاس لیٹ گئی۔ جس دن سے جگنو میاں گئے تھے ضویا ساس کے کمرہ میں سو رہی تھی — اکیلا کمرہ اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا —

کہتے ہیں چوبیس گھنٹے میں ایک ساعت ایسی بھی ہوتی ہے جب دعاؤں کی قبولیت کے در کھل جاتے ہیں۔ ایسے میں جو بھی دعا مانگی جائے پوری ہوتی ہے۔ لیکن ان ساعتوں کی نشاندہی نہیں کی گئی اور بندوں کو راضی بہ رضا رہنے کی ہدایت بھی کی گئی ہے —

ضویا نے تکیے پر سر رکھا تو اچانک سارا تکیہ سرخ سرخ خون سے تر ہو گیا۔ کانوں اور ناک سے خون جاری تھا۔ زبیدہ بیگم کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چیخ چیخ کر رونے

لگیں۔ ذرا دیر میں سارا گھر عورتوں اور مردوں سے بھر گیا— سب نے فوراً ہی ضویا کو ہاسپٹل پہنچایا۔ ڈاکٹروں کی پوری ٹیم اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ وارڈ کے باہر ماں باپ عزیز اور ملنے جلنے والے جمع تھے— ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے 'برین ہیمبرج' ہوا ہے۔ ضویا کی حالت لمحہ بہ لمحہ گرتی جا رہی تھی— ایسے میں نہ جانے کس کے ہوش و حواس سلامت تھے کہ فون کر کے جگنو میاں کو اس کی علالت کی خبر دے دی—

جگنو میاں پہلی فلائیٹ سے بھاگے آئے— ہر دم ہنسنے مسکرانے والی محبوب بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹروں کے چہروں پر مایوسی رقم تھی—

کاش ضویا ایک بار آنکھ کھول کر اپنے دیوانے کو دیکھ لے۔ دیکھ لے کہ اس کے عاشق کا کیا حال ہے؟— تب شاید——— شاید نہیں یقیناً وہ پیدا کرنے والے سے لڑ جھگڑ کر زندگی مانگ لے— اپنے لئے نہیں۔ ان کے لئے، ان کی خاطر جی اُٹھے گی—

'' جگنو میاں گڑگڑا کر ضویا کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے— اور بلک بلک کر رو رہے تھے— زبیدہ بیگم نے بیٹے کی حالت ابتر دیکھی تو انھیں اپنے سینے سے لگا لیا۔ تسلّی دلاسے کے سارے الفاظ آنسوؤں کے ریلے میں بہہ گئے— اور وہ سِسک اٹھیں۔

'' اماں ضویا ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے۔''—

جگنو میاں نے ماں سے شکوہ کیا— اور بچوں کی طرح رونے لگے۔

'' اسے روک لیں اماں— اسے روک لیں۔ ورنہ میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔''

جگنو میاں کے بین سُن کر اپنے پرائے سب ہی بے قرار ہو گئے—

'' ہائے غریب نے ضویا کو پانے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلے تھے— جان تک دینے کے لئے تیار تھا— اور جب وہ اس کی ہو گئی تو بچھڑنے کی گھڑی آ گئی—''—

ڈاکٹروں کی چارہ گری کسی کام نہیں آئی۔ نہ ہی کسی کی دعاؤں نے اثر دکھایا— اور ضویا سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلی گئی—

قیامت کا ذکر تو بہت سُنا تھا۔ لیکن قیامت کا آنا آج ہی دیکھا تھا— سب کے دل ایک انجانے خوف سے دھڑک رہے تھے— کہیں جگنو کے دل کی حرکت نہ بند ہو

جائے۔۔؟ کیسے سہہ سکے گا اتنا بڑا صدمہ۔۔؟ اور شاید قدرت کو اس پر رحم آ گیا۔۔ ضویا کا جدِ خاکی آخری سفر کے لئے گھر کی دہلیز ابھی پار بھی نہیں کر پایا تھا کہ جگنو میاں بے ہوش ہو گئے۔۔ اور بے ہوشی اتنی طویل تھی کہ وہ بیوی کے جنازے کو کاندھا بھی نہ دے سکے۔ سیکڑوں لوگوں نے ضویا کو آخری منزل تک پہنچایا۔۔ بس جگنو میاں ان میں شامل نہیں تھے۔۔ انھوں نے جس محبوب ہستی کو سہاگ کے سرخ جوڑے میں گھر کی دہلیز پر بڑے ارمانوں سے اتارا تھا۔۔ اسے کفن میں لپٹا گھر سے رخصت ہوتے نہ دیکھ سکے۔

بے قرار راتیں بے چین دن اور سفاک لمحے آہستہ، آہستہ گزرنے لگے۔۔ جگنو میاں ضویا کے غم میں پاگل ہو رہے تھے۔۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ سونے کا۔ ڈاکٹر نیند کی گولیاں کھلا کر سلاتے تو سو رہتے اور جب بیدار ہوتے تو در و دیوار سے لپٹ کر رونے لگتے۔۔ کبھی ہنستے۔۔ کبھی روتے۔۔ ثنا اور حنا ماں کا غم بھول کر باپ کو سنبھالنے میں لگی رہتیں۔۔ اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلاتیں۔ روز صبح وہ قبرستان چلے جاتے۔۔۔ اور گھنٹوں ضویا کی قبر پر بیٹھے رہتے۔ کوئی نہ کوئی انھیں زبردستی وہاں سے پکڑ کر گھر لاتا۔۔ زبیدہ بیگم نماز پڑھنے کے لئے کھڑی ہوتیں تو جگنو خفا ہو جاتے۔۔

''اماں! آپ کس کی بندگی کر رہی ہیں۔۔؟ وہی تو ہے جس نے میری ضویا کو مجھ سے چھین لیا۔۔ کیسا ظالم ہے آپ کا خدا؟''۔۔

کفر کے کلمات سن کر اماں دہل جاتیں۔۔ لیکن اس رحیم و کریم پر تو سارا حال روشن تھا۔ وہ اس کی طرف سے معافی مانگتیں۔۔ اور تڑپ تڑپ کر ایک ہی دعا مانگتیں۔۔

''پروردگار مجھ بیوہ کا آخری سہارا مجھ سے نہ چھیننا۔۔ بن ماں کے بچوں کو یتیم نہ کرنا۔۔ اسے صبر دے میرے مولا۔ ورنہ وہ مر جائے گا''۔۔

ضویا کا سہ ماہی کا فاتحہ تھا۔۔ گھر رشتہ داروں اور ملنے والوں سے بھرا تھا۔ جگنو میاں باہر اپنے غمگساروں کے درمیان اداس اور دلگرفتہ سے بیٹھے تھے۔۔ فاتحہ کا وقت ہوا تو سب لوگ انھیں سنبھال کر اندر لے گئے۔۔ اگر مضبوط ہاتھوں کی گرفت کا سہارا نہ ہوتا تو شاید اپنے پیروں سے چلنا بھی مشکل ہوتا۔ ان کی حالت دیکھ کر سب کو افسوس ہو رہا تھا۔ ''اگر یہی

حال رہا تو بے چارے جگنو میاں کیسے جئیں گے؟''موت سے پہلے مرنا اسی کو کہتے ہیں ــــ اور وہ بھی مر رہے تھے ــــ تِل تِل کر کے موت کی طرف بڑھ رہے تھے ــــ

کسی رشتے دار نے انھیں متوجہ کیا ــــ

''میاں فاتحہ پڑھو'' ــــ

جگنو میاں کے ہاتھ فاتحہ کے لئے اٹھے ــــ تو اٹھے ہی رہ گئے ــــ آنسوؤں کے پردہ کے اس پار بتول نظر آئی۔ سفید ڈوپٹے میں لپٹی سوگوار بتول چند روز قبل ہی دہران سے آئی تھی۔ اس کا شوہر ایک ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گیا تھا ــــ ابھی اس کی شادی کو ایک برس بھی نہیں گزرا تھا کہ بیوہ ہو گئی ــــ یہ سوگوار حُسن جگنو میاں کے دل پر قیامت ڈھا گیا ــــ ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی ابھی مصنوعی سانس دلانے کے عمل کے بعد دل نے ازسرِ نو دھڑکنا شروع کیا ہو ــــ جسم میں گرم گرم لہو اُچھلنے لگا ــــ اور مردہ جذبات پھریریاں لے کر زندہ ہو گئے۔

فاتحہ کے خوان باہر لے جائے گئے ــــ تو اماں اپنے بیٹے سے لپٹ کر رونے لگیں ــــ جو سکتے کی کیفیت میں سارے جہاں سے بے نیاز کھڑا ایک ٹک بتول کو دیکھ رہا تھا ــــ لڑکیاں ان کے پہلو سے لگی سِسک رہی تھیں ــــ اور دونوں بیٹے پیروں سے لپٹے بِلک رہے تھے۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے سے سارے منظر اور سارے لوگ غائب ہو چکے تھے ــــ انھیں بتول کے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا ــــ اور پھر جس نے سنا گنگ رہ گیا ــــ

جگنو میاں بتول سے عقد کرنا چاہتے تھے ــــ اگر بات صرف 'چاہنے' کی حد تک رہتی تب بھی کوئی اعتراض نہ کرتا۔ لیکن وہ تو اتنے بیتاب تھے کہ انتظار کے جاں گُسل لمحوں پر لعنت بھیج رہے تھے۔ ایک بار پھر ان پر عشق کا دورہ پڑ گیا تھا۔ کل تک جو لوگ ان کے غم میں برابر کے شریک تھے ــــ اور ہمدردی جتانے میں پیش پیش تھے اب وہی انھیں ملامت کر رہے تھے ــــ ضویا سے محبت کا دعویٰ کرنے والے جگنو میاں جو محبوب بیوی کی قبر پر گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے ــــ اب بتول کے گھر کے چکّر کاٹ رہے تھے ــــ میلا لباس، اُلجھے بکھرے بال،

اور ڈاڑھی کا جنگل سب قصۂ پارینہ بن گئے تھے — اب تو وہ اُجلے اُجلے۔ مہکے، مہکے پندرہ سال پہلے والے جگنو میاں نظر آتے تھے —

زبیدہ بیگم شرمندہ تھیں۔ بچے حیران تھے — اور دنیا والے انگشت بدنداں تھے کہ ابھی تو ضویا غریب کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا — اور یہ شادی کرنے کے لئے بے قرار ہیں۔ انھیں تو بیٹیوں کی شادی کرنا چاہیے تھی — مانا کہ مرد ہیں۔ نوجوان نہ سہی جوان تو ہیں۔ دوسری شادی کرنا کوئی گناہ بھی نہیں ہے — لیکن عشق —؟ اور محبت کا چکر! بھلا یہ بھی کوئی یقین کرنے والی بات تھی؟ —

جگنو میاں نے ایک بار پھر زہر کھانے کی دھمکی دی — ''آخر یہ مرد کتنی بار عشق کرے گا؟ — کتنی بار زہر کھانے کی دھمکی دے گا؟ اگر وہ اس کا عشق تھا تو یہ کیا ہے —؟۔ زبیدہ بیگم نے تو ایک دن جل کر کہہ دیا کہ کھالو زہر تمہیں زرا معلوم تو ہو کہ زہر کا مزہ کیسا ہوتا ہے؟'' —

زہر کون کھاتا اور جان کون دیتا۔ جان ہی دینا ہوتی تو اس وقت دیتا جب ضویا نے دنیا چھوڑ دی تھی۔

ضویا کی پہلی برسی ہوئی تو جگنو میاں کے سوا سب ہی موجود تھے — وہ بتول کے ساتھ ہنی مون' منانے جا چکے تھے۔

☆☆

آوازیں

''جاگتے رہو—— ہوشیار—!''۔

رام دین کی آواز رات کے سناٹے میں ایک خوفناک چیخ بن کر اُبھری—اور اس کے ڈنڈے کی کھٹ کھٹ صاف سنائی دی۔شاید وہ میری دیوار کے قریب ہی سے گزرا ہے۔ مجھے اس کی پھٹی ہوئی بھیانک آواز اس وقت بانسری سے زیادہ سریلی محسوس ہوئی۔دوسروں سے زیادہ حود کو جگائے رکھنے کے لئے ہی وہ ایسی بے ہنگم آواز میں پہرہ دیتا ہے—— اور محلّے والے اس کی آواز کے سہارے میٹھی نیند سوتے ہیں۔

میرے کمرہ میں باہر کی سمت کوئی دروازہ نہیں ہے۔(اگر جمعدار اور للّی دو وقت یہاں نہ آتے تو میں سمجھتا کہ یہاں کوئی دروازہ ہی نہیں ہے۔) دروازہ ہوتا تو میں رام دین کو اندر بلا کر کچھ دیر آرام کرنے کے لئے ضرور کہتا— بے چارہ اس جاڑے اور پالے میں اپنے پھٹے پرانے کمبل میں لپٹا ساری رات پہرہ دیتا ہے—اور یہ خیال مجھے ہر رات پریشان رکھتا ہے کہ غریب آدمی کہیں سردی سے ٹھٹھر کر مر ہی نہ جائے۔

رات کے سناٹے میں اس کی آواز ہی تو مجھے زندگی کا احساس دلاتی ہے اور میرے کان اس کی آواز کے منتظر رہتے ہیں— میری زندگی میں آوازوں کے سوا اب رہا بھی کیا ہے۔؟ میری آتی جاتی ہر سانس ان آوازوں کی ہی رہینِ منت ہے۔ اگر یہ آوازیں نہ ہوتیں تو میری زندگی کا تار کب کا ٹوٹ گیا ہوتا—

جس وقت میں اخبار پڑھتا ہوں اس وقت بھی مختلف آوازیں میرے آس پاس

گونجا کرتی ہیں۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آوازیں۔ بموں کے دھماکوں کی آوازیں اور زخمیوں کی چیخ پکار مجھے صاف سنائی دیتی ہے۔ ہر روز اخبار ـــــ مار دھاڑ اور خون خرابے کی خبروں سے بھرا رہتا ہے۔ ایسے میں کسی خوش گوار آواز کی توقع کرنا ہی عبث ہے۔

اب پگڈنڈیوں پر سائیکلوں کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ دودھ کے بالٹوں کی مخصوص "ٹھن ٹھن" بھی سنائی دینے لگی ہے شاید چار بج گئے ہیں۔ 'دودھ والے بھیا' روز، ہر موسم میں اسی وقت یہاں سے گزرتے ہیں۔ اور میلوں کا سفر طے کر کے اپنے گاہکوں کو دودھ پہنچاتے ہیں۔ صبح کی آمد کے احساس کے ساتھ ہی مجھ پر نیند کا غلبہ ہو گیا ہے۔ ساری رات ایک ہی طرح لیٹے لیٹے میں بری طرح تھک گیا ہوں۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں خود سے کروٹ تک نہیں لے سکتا۔ حرکت کے بغیر جینا بھی کوئی جینا ہے ـــــ لیکن پھر بھی جی رہا ہوں ـــ کیسی عجیب بات ہے کہ جب تک تندرست رہا، زندگی سے بیزار رہا اب چلنے پھرنے سے معذور ہوں تو زندگی سے موہ بڑھ گیا ہے ـــ 'حرکت' کی کمی آوازوں سے پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر بھی مرنے کا نام نہیں لیتا۔

"پیپر ـــــ"

یہ تو ہاکر کی آواز ہے۔ اخبار دروازہ میں ڈالنے کے ساتھ ہی وہ حلق سے بلغم کی طرح 'قیں' سے آواز نکالتا اور میں اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ 'پیپر' کہہ رہا ہے۔ اب بھی ہاکر کی آواز سن کر میرا جی مچل اٹھتا ہے۔ روز صبح، صبح اخبار پڑھنے کی پرانی عادت ہے۔ لیکن اب مجھے راجو کے دفتر جانے کے بعد ہی اخبار ملتا ہے۔ کبھی کبھی تو بہو مجھے اخبار دینا ہی بھول جاتی ہے۔ اسے بھولنے کی عادت ہے۔ وہ تو مجھے بھی بھول گئی ہے۔ اور میں کوٹھی کے پچھواڑے اس الگ تھلگ کمرہ میں ـــ یا کمرہ نما کوٹھری میں پڑا انتظار کی کوفت میں کڑھتا رہتا ہوں۔ اخبار کا انتظار۔ کلّو جمعدار کا انتظار ـــ خادمہ للّی کا انتظار ـــــ انتظار کا دکھ چھوٹے چھوٹے سکھ بھی دیتا ہے ـــ ہے نا عجیب بات لیکن یہی سچ ہے۔

مجھے راجو کی بھول کا دکھ زیادہ ستاتا ہے۔ اب تو کبھی کبھی مجھے یہ شک ہونے لگتا ہے کہ میں اس کا باپ ہوں بھی یا نہیں۔ دفتر جاتے وقت جب وہ کار اسٹارٹ کرتا ہے۔ یا واپس

آ کر پورچ میں گاڑی روکتا ہے—— تو مجھے اس کے آنے اور جانے کا اندازہ ہوتا ہے۔ لان میں بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اس کی بے ساختہ ہنسی— اور زندگی سے بھرپور قہقہے میرے ہونٹوں پر ایک افسردہ مسکراہٹ سجا دیتے ہیں۔ میں اس کی صورت یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ البتہ اس کے بچپن کی شکل وصورت مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بچپن میں وہ بہت خوبصورت اور گول مٹول تھا— اسے دیکھ کر تو غیروں کو بھی پیار آتا تھا۔ ہمارے لئے تو وہ ایک ایسی بیش بہا دولت تھا جس پر ہم اپنا سارا اثاثہ لٹا سکتے تھے— سب سے زیادہ تو ماں اپنے بیٹے پر فدا تھی۔ بے چاری اپنے بیٹے کی خوشیاں دیکھنے سے پہلے ہی مالک حقیقی سے جا ملی۔ اور میں نے راجو کو بڑے جتن سے سنبھالا۔ آج سوچتا ہوں کہ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ ہر کوئی میری طرح سخت جان نہیں ہوتا—

''پاپا! میری گڑیا——''

''پاپا—— میرا بال—''

بچّوں کی آوازیں سن کر میں مسکرانے لگتا ہوں۔ میری پوتی— اور پوتا اپنے باپ سے فرمائش کر رہے ہیں۔ خدا جانے راجو نے انہیں کیا جواب دیا۔ اسے ان معصوم بچّوں کی دل شکنی نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے تو کبھی اس کی کوئی فرمائش نہیں ٹالی—— حتیٰ یہ کہ جب اس نے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنے کی ضد کی۔ تب بھی میں نے اس کا دل نہیں توڑا۔ اور ہنسی خوشی اسے بیاہ لایا— شادی کے بعد ہی سے راجو مجھ سے دور ہوتا گیا۔ میں نے بھی خود کو سمیٹ لیا۔ اور سمٹتے، سمٹتے میرا وجود، میری نفی بن گیا۔ تب ہی تو میں اب راجو کو بالکل نظر نہیں آتا—

آج رات کوٹھی سے شور و ہنگامے کی آوازیں آتی رہیں۔ اونچی آواز میں انگلش میوزک کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ مردوں اور عورتوں کے اونچے اونچے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ للّی نے بتایا تھا کہ بنٹی کی سالگرہ ہے۔ میں اپنی خوشیوں کا خزانہ کسی کنجوس بنیئے کی طرح سینے میں چھپائے چپ چاپ پڑا رہا— اور راجو کی سالگرہ پارٹیوں کی یاد تازہ کرتا رہا— یار دوست میری فضول خرچی پر مجھے نصیحت کرتے تھے— بیوی سمجھاتی تھی—— لیکن مجھے راجو

کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کا شوق تھا۔ اب بھی گاہے گاہے اس کوٹھی میں ہنگامے ہوتے ہیں۔۔ لیکن میں تنہا پڑا اٹکلیں لگا تا رہتا ہوں۔

کئی دن سے مجھے عجیب، عجیب آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ یہ آوازیں کبھی دیواروں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ کبھی زمین سے پھوٹتی ہیں اور ہلکا ہلکا سا ارتعاش بھی محسوس ہوتا ہے۔ رات کے سناٹے میں تو ان آوازوں کا شور اتنا بڑھ جاتا ہے کہ رام دین کی بھیانک اور پاٹ دار آواز بھی اس میں دب جاتی ہے۔ میں اپنے ذہن پر زور دیتا ہوں۔۔ لیکن ان آوازوں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتا ہوں۔۔ شاید میں اپنی حسیات کھوتا جا رہا ہوں۔ حالانکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ ہلکی سی آواز اور آہٹ اور دبی دبی سرگوشیاں بھی میری سماعت سے ٹکرا کر واضح ہو جاتی تھیں۔۔ اور میں مطمئن ہو کر اگلی سوچ کی سمت بڑھ جاتا تھا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ میں دم بہ خود سا ان آوازوں کو سنتا رہتا ہوں کہ ان کا اسرار کھلے تو میں آگے بڑھوں۔ کہیں یہ میرے اندر کا شور تو نہیں ہے؟۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ باہر کی ساری اچھی بری آوازیں ڈیرہ ڈال کے میرے اندر بیٹھ گئی ہوں۔ یا برسوں کی خاموشی نے مجھے پریشان کرنے کے لئے کوئی چال نہ چلی ہو۔ باہر خاموشی ہو تو اندر کا شور کچھ زیادہ سنائی دیتا ہے۔۔

ابھی شور کا عُقدہ حل نہیں ہوا تھا کہ ایک نئی مصیبت نے مجھے آن گھیرا۔۔ رات کی تاریکی ہو یا دن کا اُجالا۔۔ کالے کالے کچھ سائے مجھے دیواروں پر رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہونٹ ہلتے ہیں۔ اور ان کی باتوں کی بازگشت مجھے اپنے اندر سنائی دیتی ہے۔ رقص کرتے ہوئے یہ سائے گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ میں کھلی آنکھوں سے انھیں دیکھتا ہوں۔ اور ان کی سرگوشیاں آنکھوں سے سننے کی کوشش کرتا ہوں۔ سماعت ساتھ نہ دے تو بصارت، کان، بن جاتی ہے۔ اب تو جیسے میرے بدن کے ہر حصے پر کان آگ آئے ہیں۔ اور میں جو برسوں سے آوازوں کے سہارے زندہ تھا۔۔ اب ان سے اکتا گیا ہوں۔۔ مجھے اپنے اندر کے شور پر غصہ آ رہا ہے۔ جس کے سبب باہر کی آوازوں سے میرا رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔۔ اور ہزاروں جیٹ طیّارے کانوں کے اندر پرواز کرتے محسوس ہو رہے ہیں۔ یہ

میرا واہمہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا پتہ اس کمرہ کے باہر سب کچھ پہلے جیسا ہی ہو۔

آج مجھے اپنے شہر کی ایک ایک عمارت۔ گلی اور کوچہ یاد آرہا ہے۔ میں اپنے گھر کے در و دیوار کو چھو چھو کر خوش ہو رہا ہوں۔ اور سکون و خوشی کی نرم نرم لہروں پر بہتا جا رہا ہوں۔ اچانک کئی جیٹ طیّارے ایک زوردار گڑگڑاہٹ کے ساتھ آپس میں ٹکرا کر میرے کانوں کے اندر پاش پاش ہو گئے۔ اور میں اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ سناٹا — خاموش اور بیکراں سکوت۔ اب نہ باہر کی آوازیں ہیں نہ اندر کا شور ہے۔ اور میری کمزور چھاتی پر خاموشی کا کوہِ گراں آن پڑا ہے۔ جس کے بوجھ تلے دب کر میں سانس تک لینے سے معذور ہوں دیواروں پر رقص کرتے سائے اب زمین پر اُتر آئے ہیں۔ اور مجھے اپنے فولادی ہاتھوں میں دبائے نہ جانے کس سمت بھاگے جا رہے ہیں۔

اچانک باہر کے سارے منظر غائب ہو گئے۔ پہاڑ — راستے — نشیب و فراز — بنگلے، کوٹھیاں — راجو، اس کی بیوی۔ اور پیارے پیارے بچے سب کہیں لاپتہ ہو گئے۔ باقی رہ گیا ملبے کا ڈھیر۔ گرد و غبار کے بادل — گاڑھا گاڑھا دُھواں — اور سائیں سائیں کرتے ویرانے —

''کیا صورِ اسرافیل پھونکا جا چکا ہے؟'' —

''کیا سچ مچ قیامت آ چکی ہے —؟'' —

میں اپنی پوری قوّت سے چیخ پڑتا ہوں۔

''خدارا — ان آوازوں کو زندہ کر دو — بے شک میری بصارت چھین لو۔ لیکن میری سماعت کو آوازوں کا لمس دے دو — تاکہ مجھے اپنے زندہ ہونے کا یقین آ جائے۔ ہاں! میں زندگی سے پیار کرتا ہوں۔ اور آوازوں کی بیساکھیوں کے سہارے ہی سہی — جینا چاہتا ہوں۔

☆☆

صلیب پر ٹنگی زندگی

اچانک انھیں آفس میں دیکھ کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ پورے تین ماہ کے بعد آفس آئے تھے اتنے عرصہ تک پورا اسٹاف آزادی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ ان کی موجودگی میں تو ایسی خاموشی رہتی تھی، جیسے وہ سب انسان نہ ہوں — مشین ہوں — کام —— کام اور بس کام۔ ان کا رعب ہی ایسا تھا۔ حالانکہ وہ بے حد سوبر، سنجیدہ اور رکھ رکھاؤ والے انسان تھے — کسی سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کرتے تھے — بس ان کی شخصیت ہی ایسی تھی —

سرسری نظروں سے سب کا جائزہ لے کر وہ اپنے آفس میں چلے گئے — چپراسی دروازہ پر مستعد کھڑا تھا۔ لیکن اندر نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز — وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بیٹھے تھے۔ اُداس — دلگرفتہ اور پشیمان — وہ ایک لمبی مسافت طے کر کے تھک گئے تھے — ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتے بھاگتے بے دم ہو گئے تو ہار کر واپس آ گئے۔ دراصل وہ اپنے آپ سے بھاگ رہے تھے — نہ کام میں دل لگ رہا تھا۔ نہ شراب میں سکون مل رہا تھا۔ نہ ہی دیس بدیس کے دلفریب نظاروں میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ جب بھی آنکھیں بند کرتے —— وہ منظر ان کی پلکوں کے عقب میں اپنی پوری جزئیات کے ساتھ زندہ ہو جاتا۔ شب بیداریوں نے انھیں نڈھال کر دیا تھا۔ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے بس وہی ایک منظر نگاہوں میں بسا رہتا تھا — اپنی بزدلی پر انھیں سخت ندامت تھی۔ اپنی بے رحمی پہ انھیں غصہ آتا تھا۔ اُس پل وہ انسان سے جانور بن گئے تھے۔ سفاک اور ظالم درندے کی

مانند وہ حرکت کر گزر رہے تھے — جس کی امید کم از کم انھیں خود سے تو نہیں تھی —

اچانک فون کی گھنٹی انھیں سوچوں کے گرداب سے باہر لے آئی۔ کاروباری کال تھی۔ اُلٹے سیدھے جواب دے کر انھوں نے فون کرنے والے کو ٹال دیا۔ منیجر صاحب اجازت لے کر اندر آئے چند ضروری کاغذات پر ان سے دستخط کرائے — اور پھر ان سے آفس میں بیٹھا نہیں گیا۔ دل جیسے ہر بات سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی انھیں سکون نہیں ملا۔ اور وہ بے قرار ہو کر سارے شہر میں کار دوڑاتے رہے۔ دل کا بوجھ کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر کار ان کی گاڑی مطلوبہ مکان کے سامنے رک گئی۔ کال بیل پر اُنگلی کا دباؤ ڈال کر وہ پچھتانے لگے۔ جی چاہا واپس بھاگ جائیں۔ تب ہی دروازہ کھلا۔ آٹھ نو برس کے لڑکے نے بڑی متانت سے ان کا جائزہ لیا۔

"کیا —— کیا ریاض صاحب کا یہی گھر ہے؟" —

"جی — وہ میرے پاپا تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے" —

لڑکے کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ بے اختیار ان کا ہاتھ بچّے کے سر پر پہنچ گیا۔ آہستہ سے کہا —

"جانتا ہوں — کیا آپ کی ممّی گھر پر ہیں؟" —

"جی — کیا میں انھیں بتا دوں کہ آپ ——؟" —

"ان سے بتا دیجئے کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرا نام آفتاب حسن ہے۔ آپ کے پاپا میرے دوست تھے" —

بڑی مشکل سے انھوں نے یہ الفاظ ادا کیے —

"آپ بیٹھیے — میں ممّی سے کہتا ہوں"

اس نے انھیں ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا۔ اور ممّی کو اطلاع دینے اندر چلا گیا — چند منٹ کے بعد واپس آیا تو ایک خاتون اس کے ساتھ تھیں — وہ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ ایک نظر خاتون پر ڈالی اور آہستہ سے کہا —

"سلام وعلیکم مسز ریاض" —

''وعلیکم السلام —'' نُقرئی گھنٹیوں جیسی آواز ان کی ساعت میں جلترنگ سے بجا گئی۔ دکھ کا طائران کے سینے میں بُری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا —

''تشریف رکھئے —'' خاتون ان کے سامنے بیٹھ گئیں —

''امن بتا رہا تھا کہ آپ ریاض کے دوست ہیں؟'' —

''جی — جی ہاں — بہت گہری دوستی تو نہیں تھی — لیکن بہر حال ہم دوست تھے — میں ملک سے باہر تھا اس لئے اس حادثے کی اطلاع نہ مل سکی۔''

آفتاب حسن کو محسوس ہوا کہ جھوٹ بولنا۔ وہ بھی ایسے موقعوں پر کتنا مشکل کام ہے — لیکن اپنی آمد کا کچھ جواز تو پیش کرنا ہی تھا۔

''ریاض نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا۔ یوں بھی وہ نجی تعلقات کے تذکرے سے گریز کرتے تھے۔ اور دوستوں کے معاملے میں بہت ریزرو رہتے تھے۔''

مسز ریاض نے گویا صفائی پیش کی — ان کی آواز رُندھ گئی اور وہ بے اختیار انھیں دیکھنے پر مجبور ہو گئے'' سانولے چہرے پر ستارہ آنکھیں، پیشانی پر ہلال نما کسی پرانے زخم کا نشان متناسب بدن، حزن و ملال کا پیکر، زندگی سے وابستہ خوشیاں لُٹ جانے کی تمام نشانیاں اُن کے وجود کا حصہ بن چکی تھیں۔ اور اس پل وہ جیسے مر سے گئے۔ ہاتھ بڑھا کر امن کو اپنے پاس بٹھا لیا کہا۔

''امن ماشاء اللہ بہت پیارا اور سمجھ دار بچہ ہے''

''ریاض کے بعد تو یہ ہمارا بزرگ ہی بن گیا ہے۔ چھوٹی بہن روشنی کو بھی بہت اچھی طرح سنبھالتا ہے'' —

''ماسٹر امن آپ کس کلاس میں پڑھتے ہیں؟''۔

''تھرڈ اسٹینڈرڈ میں۔ روشنی کے۔ جی میں ہے''

امن نے پوری ذمے داری سے جواب دیا۔

''روشنی کہاں ہے؟''۔

''سو رہی ہے۔ اگلی بار آپ آئیں گے تو اس سے ملیں گے۔ بہت شریر ہے۔ لیکن

بہت پیاری بھی ہے‘‘۔۔۔

’’اُف۔۔۔۔۔ یہ ہنستا بستا گھر۔۔۔۔۔ یہ معصوم بچّے اور یہ پیاری سی خاتون جو ایک وجود۔۔۔ ایک زندہ وجود سے وابستہ تھے۔ اُس کے بغیر کیسے لٹے لٹے اور ادھورے سے لگ رہے ہیں‘‘۔ ان کی طبیعت گھبرانے لگی۔ وہ اچانک کھڑے ہو گئے۔

’’اب اجازت دیجیے مسز ریاض۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں کبھی کبھی بچّوں سے ملنے آجاؤں؟‘‘۔۔۔

التجا، درخواست اور دردمندی میں ڈوبا لہجہ ۔۔۔ مسز ریاض انکار نہ کر سکیں۔ دھیرے سے کہا۔

’’آپ کو زحمت ہو گی‘‘

’’میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا جسے کرنے سے زحمت کا احساس ہو۔ پھر اب ماسٹر امن تو ہمارے دوست بن گئے ہیں۔ کیوں امن! مجھ سے دوستی کرو گے؟‘‘۔۔۔

’’شیور انکل۔۔۔‘‘ امن خوش ہو گیا۔۔۔

’’خدا حافظ‘‘۔۔۔ آفتاب حسن بھاری دل اور بوجھل قدموں سے باہر نکلے۔۔۔ امن ان کے ساتھ تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے انہوں نے اسے بانہوں میں لے کر پیار کیا اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔ چلتے وقت ان کی ہمت نہیں ہوئی کہ ایک نظر اس اُجڑی لٹی عورت پر بھی ڈال لیں۔۔۔

کئی دن وہ بہت بے کل رہے۔۔۔ دل کا تقاضہ تھا کہ بار بار اس در پر حاضری دیں۔ لیکن دماغ انھیں اس پاگل پن کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مصلحت بھی قدموں میں زنجیریں ڈال دیتی تھی۔۔۔ تقریباً دو ہفتے کے بعد ان کے دل نے بغاوت کرنے کی ٹھان لی۔ اور مُرتعش اُنگلیوں نے کال بیل پُش کر دی۔ دروازہ امن ہی نے کھولا۔۔۔ اُنھیں دیکھ کر وہ بے تحاشہ خوش ہو گیا۔۔۔ اور بے اختیار ان سے لپٹ گیا۔۔۔

’’ہاؤ آر یو مائی سن؟‘‘ اُنھوں نے پیار سے کہا۔

’’ویری فائین۔۔۔ تھینک یو انکل۔۔۔ آپ بہت اچھے وقت پر آئے۔ ہم لوگ بہت

بور ہو رہے تھے—"۔

امن انھیں ساتھ لئے ہوئے ڈرائینگ روم میں آیا—اور وہیں سے آواز دی—

"روشنی—دیکھو انکل آئے ہیں"—

بھائی کی آواز سنتے ہی روشنی جھپاک سے اندر آئی—انھیں دیکھا تو کچھ جھجھکی—شرمائی—پھر قریب آکر سلام کیا انھوں نے اسے گود میں بٹھالیا—

"امن بیٹا! آپ کی بہن تو بہت پیاری ہے۔ ایک دم گڑیا جیسی۔ اور آپ کی ممی کیسی ہیں؟"—

"اچھی ہیں۔ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ کہیں کام سے گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی—"

امن نے فوراً بوا سے چائے بنانے کے لئے کہا جو ان کے پیچھے پانی لے کر آئی تھی—

"چائے کا تکلف نہ کرو۔ ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہو کہ آدابِ میزبانی نبھاؤ—البتہ اچھے بچوں کی طرح چاکلیٹ کھا سکتے ہو"—

آفتاب حسن نے ڈھیر ساری چاکلیٹ جیب سے نکال کر امن اور روشنی کو دیں۔ دونوں بچے بڑی تمیز سے چاکلیٹ کے ریپر اتار کر رغبت سے کھانے لگے—روشنی نے ایک پیس ان کی طرف بڑھایا۔ جسے انھوں نے منھ کھول کر لے لیا۔ دونوں ہنسنے لگے—مسز ریاض شاید اس وقت آئی تھیں بچوں کی ہنسی سن کر اُدھر ہی آگئیں— کمرے میں آئیں تو اُنھیں دیکھ کر ٹھٹھک گئیں—آہستہ سے سلام کیا اور واپس چلی گئیں۔ آفتاب حسن جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اپنے اس طرح آنے سے زیادہ مسز ریاض کے واپس جانے سے خفت محسوس ہوئی۔ امن اور روشنی کو پیار کیا— کہا—

"اب میں چلتا ہوں"—

"—لیکن ممی تو ابھی آئی ہیں کچھ دیر اور رکیے نا"—امن نے رکنے کے لئے اصرار کیا۔ انھوں نے نرمی سے سمجھایا—"بیٹا! مجھے آفس بھی جانا ہے۔ پھر کسی دن آؤں گا۔ او۔کے؟"

"او۔کے۔بائی انکل۔" امن نے بے دلی سے کہا۔ اور وہ جلدی سے باہر آ گئے۔ مسز ریاض چند منٹ کے بعد ہی آ گئیں۔ چائے کی ٹرے بھی بُوا سے خود لے لی تھی۔ لیکن کمرے میں بچّوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ امن سے پوچھا۔ "انکل کہاں ہیں؟"۔ ظاہر تھا کہ جا چکے ہیں۔ پھر بھی سوال کیا۔ امن نے بتایا۔

"ممی وہ تو چلے گئے۔ میں نے روکا بھی تھا۔ لیکن۔۔۔"

افسوس تو ہوا۔۔۔ لیکن ان کا جانا ٹھیک بھی لگا۔ کم از کم وہ عام مردوں سے مختلف تو تھے۔ یہ نہیں کہ بغیر مرد والے گھر میں بہانے بہانے سے حاضری دیں۔

آفتاب حسن نے منیجر سے کہہ کر کچھ آسامیوں کی ضرورت کا اشتہار کئی مقامی روز ناموں میں دیا تھا۔ درخواستیں دیکھ کر بے روزگاری کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ انھوں نے بڑی توجہ سے ہر درخواست پڑھی اور موزوں درخواستیں الگ کر دیں تاکہ انٹرویو لیٹر بھیجے جا سکیں۔ البتہ ایک درخواست کئی دن ان کی دراز میں رکھی رہی۔ دراصل وہ تذبذب کا شکار تھے درخواست گزار مسز ریاض تھیں۔ جن کا نام شب نور تھا۔ سارے کوائف پڑھنے کے بعد انھیں اندازہ ہوا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ اور ان کا تقرر کرنا ان کے لئے چنداں مشکل نہیں تھا۔ یقیناً شب نور یہ بات نہیں جانتی ہوں گی کہ جمالی انٹرپرائیز' کے مالک وہ۔ یعنی آفتاب حسن ہیں خدا جانے اپنی تقرری پر ان کے کیا احساسات ہوں۔ کہیں وہ ان کی نیت پر شک نہ کریں لیکن انھیں ریجیکٹ کرنا بھی تو مناسب نہیں تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد انھیں ملازمت کی ضرورت بھی ہے۔ اور یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کسی دوسری جگہ انھیں ملازمت مل ہی جائے گی۔ وہ پورے خلوص سے ان کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ یقین تھا کہ وہ ان کی مالی اعانت قبول نہیں کریں گی۔ ہاتھ اٹھا کر پیسہ دینے سے ان کے پندار کو ٹھیس بھی لگتی۔ اور جاب دے کر وہ ان پر کوئی احسان نہیں کریں گے۔ بشرطیکہ شب نور اسے احسان نہ سمجھیں۔ انھوں نے منیجر کو بلا کر منتخب درخواستیں ان کے حوالے کر دیں۔

"انھیں انٹرویو لیٹر ایشو کر دیں۔" پھر شب نور کی درخواست دے کر تاکید کی۔

"ان خاتون کا انٹرویو لینے کے بعد انھیں پبلسٹی انچارج کی پوسٹ کے لئے منتخب

کر کے اپائمنٹ لیٹر دے دیں۔ باقی لوگوں کا تقرر آپ خود سمجھ کر کیجئے گا''

''سر! کیا آپ انٹرویو نہیں لیں گے؟'' منیجر نے پوچھا۔

''نہیں — میں کل باہر جا رہا ہوں۔ واپسی دو تین ہفتے کے بعد ہوگی۔'' آفتاب حسن کے دل کا بوجھ تھوڑا سا کم ہوا۔ لیکن پوری طرح آسودگی نہیں ملی تھی — نہ جانے دلِ دیوانہ کیا چاہتا تھا؟ یہ بات وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہے تھے — شب نور اور اس کے بچوں سے ملنے کے بعد دل کی خلش کچھ اور بڑھ گئی تھی — وہ اس خاندان کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے — لیکن اس طرح کہ ان کی خودداری کو ٹھیس نہ لگے۔ اب ایک موقع ہاتھ آیا تھا تو وہ بھی خلوص سے خدمت کے لئے تیار تھے —— لیکن خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہے تھے کہ شب نور کا سامنا کریں شاید اسی لئے راہِ فرار اختیار کر رہے تھے — باہر جانے کا تو محض بہانہ تھا۔

شب نور کو بڑی حیرت ہوئی جب بغیر کسی سفارش کے اسے اتنی اچھی ملازمت مل گئی۔ وہ اوپر والے کی شکر گذار تھی جس نے گھور اندھیرے میں امید اور یقین کے چراغ روشن کر کے اسے نئی زندگی کی نوید دی — وہ آفتاب حسن کو یہ خوش خبری سنانا چاہتی تھی —— لیکن وہ تو اچانک ہی گم ہو گئے تھے — روز دفتر سے واپس آ کر وہ امن سے ان کے بارے میں پوچھتی تھی اور روز نفی میں جواب سن کر مایوس ہو جاتی تھی — ایک وہی تو تھے — جنہوں نے ریاض کا دوست ہونے کے ناطے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ جب کہ ان کی دوستی بھی کوئی خاص نہیں تھی — خاص خاص دوستوں نے بس برائے نام وہ بھی بس شروع میں چند روز ان کی خیر خبر لی تھی — حد ہے کہ ریاض مرحوم کے بقایا جات کے سلسلے میں بھی اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی — اور اب تو یہ حال تھا کہ اسے آفس میں دیکھ کر وہ لوگ کترانے لگے تھے۔ بہر حال اس ملازمت نے اس کی بہت سی فکریں دور کر دی تھیں۔ زندگی ایک ڈھرّے پر آ گئی تھی۔ بچے بھی پابندی سے اسکول جا رہے تھے — آفس میں اس کا وقت اچھا گذر رہا تھا۔ کام بھی بہت زیادہ نہیں تھا۔ منیجر صاحب اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور کام کے سلسلے میں اسے گائڈ بھی کرتے تھے — البتہ اصلی مالک سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کا شعبہ بھی الگ تھا۔ اور وہ اپنے کام کے لئے فاروقی صاحب اور منیجر صاحب کو جوابدہ تھی —

کئی ہفتے کی غیر حاضری کے بعد آفتاب حسن واپس آئے تھے دفتر آتے — آفس میں بیٹھتے اور گھر کی راہ لیتے۔ ایک دن وہ امن اور روشنی سے بھی ملنے گئے۔ لیکن اس وقت شب نور آفس میں تھی۔ بچوں کو ان کے پسندیدہ چاکلیٹ دیئے کچھ چھوٹے موٹے تحائف ان کے واسطے لائے تھے وہ بھی دیے۔ امن نے انہیں بتایا کہ ممی کو جاب مل گئی ہے۔ انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور شب نور کے آنے سے پہلے ہی واپس چلے گئے۔ امن نے اسے خوش خبری دی۔

''ممی — انکل آئے تھے۔ یہ دیکھئے ہمارے لئے کیسے اچھے گفٹ لائے ہیں اور چاکلیٹ بھی'' —

''مجھ سے ملے بغیر ہی چلے گئے۔'' شب نور کو ان کا لیے دیے رہنے والا رویّہ اچھا لگتا تھا لیکن ایسی بھی کیا مغائرت! غنیمت تھا کہ وہ اس کے گھر کا رستہ نہیں بھولے تھے — ریاض مرحوم کی زندگی میں وہ ان کے دوستوں سے ناواقف تھی ان کے انتقال کے بعد آفس کے چند ساتھی البتہ گھر آئے تھے — بس رسمی سا انداز تھا۔ جب کہ آفتاب حسن اس کے بچوں سے گھل مل گئے تھے — لیکن اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی تھی — زیادہ تر وہ اس کی غیر موجودگی میں ہی میں آتے تھے — شاید ان کے کردار کے اس رخ نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔

''لو بھئی! آج اپنے مالک کی زیارت بھی کرلو''۔

اس کی ساتھی رفیعہ نے اشارہ سے اسے دکھایا — وہ دونوں پہلی منزل پر باہر کھلنے والی کھڑکی میں کھڑی تھیں — ابھی ابھی لنچ سے فارغ ہو کر اٹھی تھیں۔ شب نور نے بہت اشتیاق سے دیکھا — آفتاب حسن گاڑی کے پاس کھڑے کسی شخص سے باتیں کر رہے تھے — شب نور کی توجہ آفتاب حسن کی طرف تھی — اس نے رفیعہ سے پوچھا۔

''کیا یہ صاحب اکثر یہاں آتے ہیں؟'' —

''تم کس کے بارے میں کہہ رہی ہو؟'' — رفیعہ نے پوچھا —

''وہ نیلے سُوٹ والے؟'' —

''ارے وہی تو ہیں مسٹر جمالی۔ اس فرم کے مالک'' —

''۔۔یعنی مسٹر آفتاب حسن؟''۔۔شب نور نے تصدیق چاہی۔

''ہاں بھئی۔۔پورا نام آفتاب حسن جمالی ہے۔ جمالی انٹرپرائیزز کی بنیاد ان کے والد نے رکھی تھی۔۔ان کی زندگی ہی میں مسٹر جمالی اس فرم کو ترقی کی بلندیوں پر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔۔اور اب تو وہ تنہا اس کے مالک ہیں''۔۔

رفیعہ نے بتایا۔ شب نور کچھ بے یقینی سے رفیعہ کی باتیں سُن رہی تھی۔۔ کیسی عجیب بات تھی کہ وہ آفتاب حسن کے آفس میں کام کر رہی تھی۔ اور آج پہلی بار اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا تھا۔۔انھوں نے ازراہِ کرم اسے جاب دی تھی۔ لیکن ایک بار بھی اس پر اپنی مہربانی اور احسان کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بلکہ خود کو اس سے پوشیدہ ہی رکھا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے گھر آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔۔ آئے بھی تو بچوں سے مل کر چلے گئے۔۔ کیا آج کے زمانے میں کوئی انسان ایسا بے غرض اور بے لوث بھی ہو سکتا ہے۔؟''۔۔

شب نور کے دل میں ان کی منزلت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔۔ دوسرے دن وہ بے دھڑک ان کے آفس میں چلی گئی۔ وہ اسے دیکھ کر گھبرا گئے۔ پھر سنبھلے۔۔ مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا اور اسے کرسی پیش کی۔

''آپ کیسی ہیں مسز ریاض؟'' بڑے اخلاق سے اس کی خیریت دریافت کی۔

شب نور دل میں جز بز تو ہوئی لیکن ظاہر نہیں کیا۔ رسمی انداز میں کہا۔۔

''مہربانی۔۔میں ٹھیک ہوں''۔۔

''آپ کو یہاں کسی قسم کی زحمت تو نہیں ہوتی؟''۔۔

اب جب بات کھل ہی گئی تھی اور ایک نہ ایک دن تو کھلنا ہی تھی۔۔ تو اب مزید اداکاری کی ضرورت بھی نہیں تھی۔۔

''جی۔۔ کچھ شکایتیں تو ہیں'' شب نور نے سنجیدگی سے کہا۔۔

''کیسی شکایتیں؟'' وہ بھی سنجیدہ بلکہ متفکر ہو گئے۔۔

''آپ نے مجھے اپنی فرم میں ملازمت دی۔۔ لیکن اس بات کو مجھ سے چھپایا۔۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔۔؟'' شب نور کی آواز رُندھ گئی۔ وہ چپ

رہے۔

''آپ نے مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع تک نہیں دیا؟''—

''کیا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا—؟'' دھیرے سے کہا—

''میں احسان فراموش تو نہیں ہوں کہ آپ کی نوازش اور ہمدردی کا اعتراف نہ کرتی— آپ کیسے سمجھیں گے کہ میں کتنی شرمندگی محسوس کر رہی ہوں''—

مسز ریاض میں یہی تو نہیں چاہتا تھا۔ آپ سے میری بس ایک ہی درخواست ہے کہ میرے خلوص پر شبہ نہ کریں۔ یہ نہ کوئی احسان ہے— نہ نوازش— آپ کو ملازمت کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے آپ نے جمالی انٹر پرائیٹرز میں اپلائی کیا

کیونکہ اتفاق سے میں اس فرم کا کرتا دھرتا ہوں اس لئے آپ کا تقرر کر دیا۔ بس اتنی سی بات ہے''—

''بہر حال میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں''—

شب نور اب بھی سنجیدہ تھی—

''اگر آپ مصر ہیں تو سمجھیں آپ نے شکریہ ادا کر دیا۔''—

آفتاب حسن نے بے چارگی سے کہا—

''ایسے نہیں۔ باقاعدہ آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ اور اس کے لئے آپ کو میرے گھر آنے کی زحمت کرنا ہوگی''—

''بہتر— میں کسی دن حاضر ہو جاؤں گا''—

''کسی دن کیوں؟— آج شام کو آپ آ رہے ہیں''—

شب نوران کا جواب سنے بغیر آفس سے نکل گئی—

ضمیر کا تقاضہ تھا کہ وہ شب نور سے وہ سب کہہ دیں جس نے انھیں مہینوں سے بے کل کر رکھا تھا۔ لیکن ردِ عمل کا خوف انھیں حقیقت بیانی سے روک رہا تھا— وہ حسب وعدہ شب نور کے گھر گئے۔ بچوں سے باتیں کیں— شب نور کی خاطر مدارات بھی قبول کی۔ لیکن الفاظ نے ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر ہی واپس چلے آئے۔ وہ گھر جو اپنے مالک اور

سرپرست کے بغیر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ انھیں کاٹنے دوڑتا تھا۔ ہنستے مسکراتے بچے اچانک پاپا کا ذکر کر کے اداس ہو جاتے تھے ـــ اور شب نور کی آنکھیں خلا میں کچھ تلاش کرنے لگتی تھیں۔ وہ ان کے غموں کا مُداوا کرنے سے قاصر تھے۔ ان کی زندگی میں جو ادھورا پن تھا ـــ جو کمی تھی وہ قارون کا خزانہ لٹا کر بھی واپس نہیں لائی جا سکتی تھی۔ شب نور کی سونی کلائیاں۔ اُجڑی ہوئی مانگ چند ہزار روپے کی ملازمت سے کیسے سج سکتی تھی ـــ اب تو انھیں اس کے گھر جانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ یہ احساس کہ وہ اس کے آفس میں ہے ان کے دل کی خلش میں اضافہ کرنے کے لئے بہت تھا۔ ایسا کیا کریں کہ ضمیر کی چبھن سے انھیں نجات مل جائے ـــ کیا شب نور اور اس کے بچّوں کو اپنی زندگی میں شامل کرنے سے اس گناہ کا ازالہ ہو سکتا ہے اور کیا ان کا یہ فیصلہ اسے قبول ہوگا ـــ؟ اسے انکار کرنے کا حق ہے۔ وہ اپنا مقدمہ اس کے حضور پیش کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتے؟ ـــ لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا ـــ تھوڑا سا وقت اور گزر جانے دیں۔ وقت بھی کبھی کبھی بڑا ظالم ہو جاتا ہے۔ ایک صحیح وسالم وجود کو اپنے بے رحم قدموں تلے روندتا ہوا گزرتا ہے ـــ اور پھر بھی پوری طرح نہیں گزرتا۔ جیسے ان کے ساتھ ہو رہا تھا ـــ

اس بار وہ پورے چھ ماہ تک ملک سے باہر رہے۔ واپس آئے تو بالکل بدلے ہوئے آفتاب حسن تھے ـــ صحرا نوردی نے صحت تباہ کر دی تھی ـــ شب بیداریوں نے خاصا کمزور کر دیا تھا۔ برداشت کی حدیں ختم ہو گئی تھیں۔ حوصلہ جواب دے گیا تھا ـــ وہ دل گرفتہ، شکست خوردہ اور کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح شب نور کے سامنے تھے جو انھیں اس حال میں دیکھ کر بدحواس ہو گئی تھی۔ لاتعلقی میں جو ایک تعلق ہوتا ہے کچھ وہی رشتہ ان کے درمیان تھا۔ وہ شب نور کے سامنے دو زانو تھے ـــ

''شب نور! آج میں تمہارے سامنے اپنا جُرم قبول کرنے آیا ہوں۔'' اور پھر انھوں نے بلا کم و کاست ساری داستان بیان کر دی۔ کچھ بھی نہیں چھپایا۔ غزالہ کے چھوڑ کر چلے جانے سے لے کر ریاض کے ایکسیڈنٹ میں مرنے تک کی ساری کہانی سُنا دی۔ غزالہ ان کی بیوی ہی نہیں محبوبہ بھی تھی۔ جسے انھوں نے بے انتہا چاہا تھا ـــ وہی غزالہ ان سے قطع تعلق کر گئی

تھی۔ وہ بے تحاشہ پینے لگے تھے — اور اس دن شراب کے نشے میں گاڑی چلاتے ہوئے ان سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ریاض سڑک پار کرتے ہوئے گاڑی کی زد میں آگیا تھا اور وہ رکے بغیر نکلے —— چلے گئے تھے۔ اگلی صبح اخبار سے انھیں پتہ لگا کہ حادثے کا شکار آن دا اسپاٹ ختم ہو گیا تھا — پولیس اس کار کی تلاش میں تھی جس سے حادثہ ہوا تھا — وہ ڈر گئے — بدنامی اور سزا کے خوف سے انھوں نے راہِ فرار اختیار کی اور ملکوں، ملکوں بھٹکتے پھرے — واپس آکر بڑی مشکل سے مسز ریاض کو تلاش کیا — تب سے لے کر اب تک احساسِ جرم نے انھیں چین نہیں لینے دیا۔ لمحہ لمحہ کی موت نے انھیں زندگی سے دور کر دیا —

''شب نور میں تمھارا مجرم ہوں۔ امن اور روشنی کو باپ کے سائے سے محروم کرنے کا گناہ کیا ہے میں نے۔ تمہاری زندگی کے سارے رنگ میں نے چرائے ہیں۔ تم مجھے جو چاہے سزا دو۔ میں اُف نہیں کروں گا'' —

'' —— لیکن ریاض تو — انھیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ — وہ تو گاڑی سے چوٹ کھانے سے پہلے ہی ختم ہو گئے تھے'' — اور یہ پوسٹ مارٹم کی رپوٹ سے پتہ چلا تھا'' ——

شب نور نے اٹکتے ہوئے سارا واقعہ بتایا۔ انھیں یقین نہیں آیا — بڑی مشکل سے شب نور نے انہیں یقین دلایا۔ اسے اس شخص پر اُس پل بہت رحم آیا —

''آپ اتنے عرصہ تک خود کو اس جرم کی سزا دیتے رہے جو آپ نے کیا ہی نہیں تھا —''

شب نور سِسک اٹھی — بے اختیار اس نے انھیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ اس کی بانہوں میں منہ چھپائے کسی ننھے سے بچّے کی طرح بلک رہے تھے — ان کے سینے پر دھری احساسِ گناہ کی منوں وزنی سِل سَرک گئی تھی — وجود ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ اور دو مہربان بانہیں انھیں اپنے حلقے میں لئے نئی زندگی کی طرف آہستہ آہستہ واپس لا رہی تھیں —— آسودگی، اطمینان اور خوشی ان کی رگ رگ میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

تھکے ہوئے مسافر کی مانند انھوں نے شب نور کے سینے پر سر ٹیک دیا — اور پلکیں موند کر بے خواب آنکھوں میں نئے سپنے سجوئے ایک نئے سفر پر گامزن ہو گئے —

☆☆

پہچان کا سفر

سنسار کے چار کھونٹ گھومی پر من کا قرار کہیں نہ ملا۔ اب پانچواں کھونٹ کہاں کھوجتی کہ اس کا گیان تو اس کے پہلے آنے والوں کو بھی نہیں تھا۔ آگے کا پتہ نہیں کہ کب کوئی مہا گیانی انجان راہوں پر چلتے چلتے اچانک یہ اعلان کردے کہ اس نے پانچواں کھونٹ کھوج لیا ہے۔ اس بیراگن کو تو کوئی راہ ایسی نہ ملی جس پر چل کر اسے اس پیڑا سے نجات مل جاتی ——— جو اس کے روم روم میں بسرام کر رہی تھی۔ پیڑا بھی ایسی جو نہ کہتے بنے اور نہ ہی اپنا آپ کسی کو دکھاتے بنے۔ تل تل کر کے مرتی وہ برہن جس کا پیا پردیس سدھارتا ہے من کی جلن اور تن کی دکھن کو اس آس میں سہتی ہے کہ وہ چیت چور کبھی تو واپس آئے گا۔ پر وہ ابھاگن کس کی باٹ تکتی ——— کس کی راہ دیکھتی ——؟ کہ نہ کسی نے اس کا چیت چرایا تھا اور نہ اس نے کسی کو ہرا تھا وہ تو اپنے ہی گھر آنگن میں لٹی تھی۔ اور اپنے ہی دیش میں اپمانت ہوئی تھی۔ ایسے میں اس کے من کی پیڑا اور تن کی دکھن کو کون دیکھتا۔ کون سمجھتا؟۔ پھر جب تن من کی ساری پیڑا ایک کوکھ میں سما جائے اور کچے پھوڑے سمان بھیتر بیٹھ جائے تو کون پرائی کوکھ میں جھانک کر دیکھے اور یہ جاننے کو اُتاؤلا ہو کہ اس کنواری ان چھوئی دھرتی پر بیج کس نے ڈالا ——؟

ماٹی بھی کب اس بیری ہاتھ کو پہچانتی ہے ——

گھور اندھیرے میں لپلپاتے نفرت کے شعلوں سے پرے کوئی صورت دکھ بھی جائے تو اس کی پہچان کیسے ہو؟۔ اس پل تو ہر چہرہ ایک جیسا لگتا ہے۔ اور سارے چہرے

راکھشسوں کے چہرے جان پڑتے ہیں۔ اگر ان کے مکھوٹے اتاریں تو دیش کے سارے راون ننگے ہو جائیں۔ پر اتنا ساہس کون کرے؟ ظلم کی آندھی اور نفرت کے جھکڑ۔۔۔؟ پہچان کے سارے دیئے بجھا دیتے ہیں۔ اور بدلے کی بھاؤنا رشتوں کا مان سمان بھلا دیتی ہے۔ اس پاپی آگ میں ہر رشتہ جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ غصہ، نفرت، اور بدلے کی آندھی کو روکنے والے مضبوط اور ساہسی ہاتھ بھی اس چھن بیگانے ہو کر اپنی گود میں سوئے رہتے ہیں۔ مانو ماٹی کے کھلونوں کے ٹوٹے پھوٹے بیکار انش ہوں۔ جیتے جاگتے شریر میں لاوے سا دوڑتا گرم لہو بھی برف سا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ماؤں کا گورو اور بہنوں کا مان رکھنے والے۔۔۔ اتہاس کے کالے پنوں میں چھپ کر سدا کے لئے کلنکت ہو جاتے ہیں۔۔۔

ابھی کل کی بات ہے جب نئے نویلے پودے پر ننھی سی ایک کلی مسکرائی تھی۔ ان دنوں آکاش اُجلا اور نیلا تھا۔ دھرتی پوتر اور ماں کی گود سمان مہربان تھی۔ تب آکاش امرت برساتا تھا.........اور مدبھری ہوائیں میٹھی لوریاں دیتی تھیں۔ ہرے بھرے کھیت امرائیاں اور پنگھٹ اپنے تھے۔۔۔ سارا سنسار اپنا جان پڑتا تھا۔ ان دنوں نفرت کی کھیتیاں نہیں اُگائی جاتی تھیں۔۔۔ ہر سو پریم کے گیتوں کا جلترنگ سا بجتا تھا۔۔۔ وَن، اُپوَن، پربت، ندیاں، ساگر۔۔۔ ساری دشاؤں میں ایک ہی راگ سنائی پڑتا تھا۔۔۔ پریم اور بھائی چارے کا راگ۔ ہر ہردئے وشال تھا۔۔۔ ساگر کی طرح۔ اور اس کے ہردئے میں تو مانو سمو چے سنسار کا پریم سما گیا تھا۔

سمئے تھوڑا آگے سرکا۔۔۔ اس کے گھر کا کچا آنگن بیلا، چمیلی اور موتیا کی مدُھر سگندھ سے بھر گیا۔ سکھیاں کبھی اس کے گورے ہاتھوں میں رچی مہندی کو نہارتیں۔ اور کبھی ماتھے پر جگ مگ کرتے جھومر اور گول کلائیوں میں کھن کھن بجتی چوڑیوں اور چھن چھن کرتی پائل کو لالسا سے تاکتیں۔۔۔ اس کا گوٹے کناری کا سرخ سہاگ کا جوڑا کنوارے دلوں میں اُمنگ اور رسیلے نینوں میں لجّا بھر دیتا۔ نہ جانے کتنی پلکوں تلے سلونے سپنے سجے۔۔۔۔ اور نہ جانے کتنے دل دھڑکے۔ وہ بھی جو سہاگ کا جوڑا پرانا کر چکی تھیں۔۔۔۔ اور وہ بھی جو پیا دیس جانے کو تیار بیٹھی تھیں۔۔۔۔ جلن اور ایرشا سے مَر مَر گئیں۔ مر تو وہ بھی رہی تھیں۔ لیکن یہ مرنا

سکھ اور خوشی کا مرنا نہیں تھا —— اور پھر یہ بھی تھا کہ اس کا مہندی رچا گورا ہاتھ ایک ٹھنڈے لجلجے ہاتھ میں پھنسا تھا۔ اور ہڈیوں پر مڑھی کھال والا ایک سوکھا پنجر اس کے پہلو میں براجمان تھا۔ مانو سیدھا شمشان سے اٹھ کر آ گیا ہو ——

نیلا اُجلا آکاش۔ پوتر، مہربان دھرتی، کھیت پنگھٹ، امرائیاں اور کچا آنگن سب پیچھے رہ گئے تھے —— ساتھ رہ گئی تھی —— انجان راستوں کی دھول جس نے پل بھر میں اس کے نینوں میں سجے سارے سپنوں کو خاک میں ملا دیا تھا —— اور من میں بیٹھا دُکھ شیشے کی کرچیاں بن کر آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔ یہ چبھن لہو کے رنگ میں ڈھل گئی تھی۔ پھر بھلا اسے آگے کا راستہ کیسے دکھتا ——

لکڑی کے موٹے تختوں والا بھاری پھاٹک کیا کھُلا مانو اس کے بھاگیہ ہی سو گئے —— اونچے اونچے دروں والے دوہرے دالان، کمرے۔ کوٹھریاں آنگن، باغ اور بردٹھے جیسے اونچی دیواروں کے پیچھے ایک سنسار بسا ہو۔ پر اس کی سوچ میں تو پنجرے کی ساری تنگی اور گھٹن اس حویلی میں سمٹ آئی تھی —— سائیں سائیں کرتی ہوائیں اس کا دم گھونٹتی تھیں۔ اور اس کا وجود پرچھائیں بن کر یہاں وہاں بھٹکتا تھا —— اس کی آتما تو شریر چھوڑ کر اپنے سپنوں کا سنسار کھوجنے نکل پڑی تھی۔ باقی رہ گئی تھی ایک چلتی پھرتی لاش۔ جو سانسوں کی ڈور سے بندھی جیون کی تہمت کا بوجھ ڈھو رہی تھی ——

وہ رات کہ ہر رات سے زیادہ کالی تھی۔ اجلا آکاش نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ بس ایک سیاہ چادر سی ہر سوتنی ہوئی تھی۔ چیختی —— چنگھاڑتی ہواؤں میں کرودھ تھا۔ ہر طرف سے مانس گندھ —— مانس گندھ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مانو پری کتھاؤں کا کالا دیو لال پری کی کھوج میں چل پڑا ہو —— اور پھر سچ مچ پر لئے آ گئی ——

موٹے موٹے تختوں والے پھاٹک کے فولادی کنڈے اور زنجیریں ٹوٹ کر دھرتی پر آ گریں۔ سنگینوں کی چمک اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے سنسار کانپ اٹھا —— خنجر کی لپلپاتی زبانیں بجلی بن کر ٹوٹ پڑیں۔ سرخ تازہ اور گرم لہو پیاسی دھرتی کو سیراب کر رہا تھا —— ایک جوالا مکھی تھا۔ جس کی لپٹیں دھرتی سے آکاش تک جا رہی تھیں۔ مانو سمندر دیوتا کو کرودھ آ گیا

ہو۔اور یہ کرودھ سیلاب بن کر چاروں لوک کو تباہ کرنے نکلا ہو—

یہ پرلے ساری کی ساری اس کی نربل کایا پر گزر گئی۔

''وہ کون تھے—''؟—

''وہ کیوں آئے تھے—؟''—

''کہاں سے آئے تھے—؟''—

''یہ سب کیسے ہوا—؟ کیوں ہوا ——؟۔بس کچھ وِش بھری زبانیں تھیں۔واسنا سے پُر غلیظ آنکھیں تھیں اور کھر درے بے رحم ہاتھ تھے۔وہ ایک کونے میں نچی کھچی گڑیا کے سمان پڑی تھی۔اس کی ویران آنکھوں کے سامنے دو ٹھنڈے، لجلجے ہاتھ اپنے ہی پہلو میں بے جان سے لٹکے ہوئے تھے۔اس نے نفرت سے تھوک دیا۔رونا چاہا تو آنسو نہیں نکلے— ہنسنا چاہا تو درد کی تیز کٹار اس کے کلیجے کو چیر گئی۔اس نے اپنا آپ جو اس سمئے پرایا سا لگ رہا تھا، بڑے جتن سے سمیٹا اور اپنا بچا کھچا وجود لے کر اس چار دیواری سے باہر آ گئی۔وہ چلتی رہی۔اور اس کے پاؤں تلے سے کٹھور دھرتی کن کن کر کے سرکتی رہی۔اور سر کے اوپر آکاش ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہوتا رہا—سورج پگھلتا رہا—چاندنی آگ برساتی رہی—— کھیت، پنگھٹ اور امرائیاں پرچھائیں بن کر اس کے سامنے سے گزرتے رہے —پر اس کے پاؤں کہیں نہ ٹکے۔وہ راہ میں آنے والا ہر چہرہ دھیان سے دیکھتی—

''یہ ہے——؟''—

''نہیں—یہ—نہیں ہے''—

''وہ—؟—وہ بھی نہیں—''—

اس کی کھوج کا سفر ختم ہونے کو نہ آتا۔چلتے چلتے اس کے پاؤں لہولہان ہو گئے۔ نربل شریر جواب دے گیا۔چہروں کی پہچان کرتے کرتے آنکھیں زخم، زخم ہو گئیں۔اور ستاروں سمان جگ مگ کرتے نینوں کے کٹورے دھند میں چھپ گئے۔اس دھند کی اوٹ میں سارے راستے اوجھل ہو گئے۔اور وہ تھک ہار کر دھرتی پر ڈھے گئی۔

اچانک ایک ننھی سی چیخ نے اسے جھنجھوڑ دیا اور اس کے مردہ تن میں جان سی پڑ گئی۔

اس چیخ کے ساتھ وہ پھر سے جی اٹھی۔ وہ چیخ اس کی کوکھ سے پھوٹی تھی۔ اور اس کے من کے کیواڑ کھول کر باہر آئی تھی۔ یہ معصوم چیخ جس کا کوئی نام نہیں تھا—— کوئی پہچان نہیں تھی—— اس نے ممتا کی گرمی اور نرمی کے ساتھ اس ننھی سی چیخ کو اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ اس کی کمزور بانہوں میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی۔ اور وہ اسے چھاتی سے لگائے بھاگتی رہی —وہ پہلے خوب ہنسی۔ ہنستی رہی۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی—روتی رہی— آنسوؤں کا باندھ ٹوٹا تو ایسا کہ خود اپنے ہی آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اس نے ہنسنے اور رونے کے بیچ آکاش کو دیکھا—اسے پہلے جیسا اُجلا دیکھ کر حیرت ہوئی۔ یہ اب تک کہاں چھپا تھا—اور قدموں تلے بچھی ہوئی دھرتی بھی اب اتنی کٹھور نہیں تھی— شاید یہ سب اس لئے تھا کہ اس کی آنکھوں کی دھند اور کیچ صاف ہو گئی تھی۔ وہ سنسار کو اپنی اجلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی— جینے کی ہمت جٹانا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ اپنے حسابوں سے تو وہ کبھی کی مر چکی تھی— پر اب وہ اس کے لئے جینا چاہتی تھی۔ جو اس کے کچلے اور روندے شریر کا ایک انگ تھا—

اس کے سامنے پڑے ہوئے سکّوں اور روٹی کے ٹکڑوں کا مول نہ پہلے تھا— نہ اب تھا— اپنے آدھے کھلے اور آدھے ڈھکے شریر سے انجان وہ چیتھڑوں کے ڈھیر میں لپٹے اس ننھے سے وجود میں کھوئی رہتی۔ کبھی اسے چومتی۔ کبھی اس کے گالوں پر پیار کرتی۔ کبھی اس کی آنکھوں کے دیئے اپنے سوکھے ہونٹوں سے ڈھانپ دیتی— ممتا اور پیار کے اس سکھ سنسار میں کھوئی وہ اپنے آس پاس کی دنیا سے انجان تھی—

اس دن وہ کچھ زیادہ ہی باؤلی ہو رہی تھی۔ بار بار اس ننھی سی جان کو چھاتی سے لگا کر پیار کرتی اور کبھی بانہوں میں اٹھا کر اسے نہارتی۔ پہلی بار 'ماں' کا بول سن کر وہ نہال ہو گئی۔ جن ہونٹوں نے اسے ماں کہہ کر پکارا تھا انہیں پیار کرتے نہیں تھکتی تھی— یہ بول اس کے کانوں میں مدھر سنگیت بن کر اترا تھا— دھرتی، آکاش بادل اور ہوا— سب ایک ہی شبد کی تکرار کر رہے تھے۔ ماں—ماں—ماں—وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی—

''پگلی ہے'' ایک آواز—اس سمے تو وہ سچ مچ پاگل ہو رہی تھی۔ برا کیوں مانتی—

''اگر یہ سالی صاف ستھرے کپڑے پہن لے۔ ذرا سا سرخی پوڈر لگا لے تو رام

قسم۔ہم اس سے زیادہ سندر بچہ اسے دے سکتے ہیں''

دوسری آواز— یہ آواز نہیں زہر میں بجھا ہوا تیر تھا۔ جو اس کے کلیجے میں اتر گیا۔ اس نے اپنی جلتی ہوئی لال، لال آنکھوں سے اسے گھورا— 'وہ' بڑے کریہہ انداز میں اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ واسنا میں ڈوبی، گندی اور غلیظ آنکھیں ویسی ہی گندی زبان۔ ویسی ہی گھناؤنی مسکراہٹ۔ وہی شیطانی خواہش—

''یہ وہی ہے''—

''ہاں—وہی—بالکل وہی''—

اگلے پل وہ اس پر جھپٹ پڑی—

''پاپی— کمینے، ہتھیارے—راکھشس—میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔تو وہی ہے—وہی ہے''—

وہ چیخ اٹھی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اور ہونٹوں سے گندی گندی گالیاں اُبل رہی تھیں اس کی سوکھی، سخت اور کھُردری انگلیوں کی گرفت مغرور گردن پر سخت ہوتی گئی— سخت— اور سخت—واسنا سے لت پت غلیظ آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل پڑیں اور زبان باہر لٹک آئی۔ اس نے دھکا دے کر اسے پرے دھکیلا۔ اور نفرت سے اس پر تھوک دیا۔ اور پھر اپنے آس پاس کی آوازوں اور چیخ پکار سے بالکل انجان اور لاپرواہ سی۔ وہ پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی اور بچّی کو چھاتی سے لگا کر دودھ پلانے لگی۔ مانو اس سنسار میں صرف وہ تھی۔ اور اس کی بچّی۔ اب وہ بالکل شانت تھی۔ من میں بھڑکتی جوالا ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اور چہروں کی کھوج کا سفر ختم ہو گیا تھا—

☆☆

میاں کی حویلی

میاں کی حویلی کچھ اوپر سو سال پرانی تھی۔ حویلی کے مالکان زمیندار تھے ۔۔اور میاں کہلاتے تھے۔ اس لئے اس کا نام 'میاں کی حویلی' پڑ گیا ۔۔۔ زمینداری تو ختم ہو گئی لیکن حویلی کا رعب دبدبہ آج بھی قائم تھا۔ اونچی برجیوں والا بلند و بالا شاندار پھاٹک ۔۔ دیکھ کر اس کی عظمت کا احساس ہوتا تھا ۔۔ خوبصورت محرابوں والے سات دروں کے دوہرے تہرے دالان، کشادہ صحنچیاں اور رنگین شیشوں والے دروازوں کے عقب میں کھلنے والے بڑے بڑے ہال جھلملی والی کھڑکیاں حویلی کا قیمتی اثاثہ تھیں۔ وسیع و عریض صحن موتیا، بیلا، موگرا اور رات کی رانی سے مہکتا تھا ۔۔ گرمیوں میں چھڑکاؤ کر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نواڑی پلنگ بچھائے جاتے تھے ۔۔ جن پر سفید براق چادریں کسی رہتیں اور تکیوں کے پاس بیلے کی کلیاں مہکتی رہتیں ۔۔ پھولوں کی کیاریوں کے پاس گھڑونچیوں اور چوکیوں پر کوری، کوری صراحیاں اور جھجھریاں ٹھنڈے پانی سے چھلکتی رہتیں۔ ایک طرف گیارہ سیڑھیاں چڑھ کر شاندار امام باڑہ تھا ۔۔ مردانخانہ بھی کئی کمروں پر مشتمل تھا۔ مہمان خانہ اس کے علاوہ تھا۔ حویلی کے پچھواڑے اصطبل اور شاگرد پیشہ کی عمارتیں تھیں۔ حویلی کیا تھی ایک مکمل سلطنت تھی۔ جہاں ہر وقت ایسی چہل پہل رہتی تھی کہ تقریب کا گمان ہوتا تھا۔

تقسیم ملک کے بعد حویلی کی رونقیں ختم ہو گئیں۔ کئی خاندان پاکستان چلے گئے۔ کچھ لوگ تلاشِ معاش میں ادھر اُدھر نکل گئے۔ اب لے دے کے جمن میاں، ان کی بیگم اور بچے ہی رہ گئے تھے۔ یا پھر گنتی کے چند ملازم تھے جو آوارہ روحوں کی مانند حویلی میں اندر باہر

خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔

جمن میاں کو اپنی حویلی سے محبت نہیں عشق تھا۔ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ انہیں یہ حویلی عزیز تھی — انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ وہ اس حویلی کی عظمت اور وقار کو کسی حال میں نظر انداز نہ کریں۔ زمانے کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر انہیں ہول آتا تھا — جب اولادیں اپنے بزرگوں کی عزت سے منہ پھیر سکتی ہیں تو مٹی اور کنکر پتھر کی عمارت بھلا کس گنتی میں تھی — ؟ —

جمن میاں کی بیٹیاں بیاہ کر سسرال چلی گئیں — اور بیٹوں نے حصول تعلیم کی خاطر امریکہ اور لندن کی راہ لی۔ اب حویلی میں بیگم بولائی، بولائی پھرتیں اور مردانخانہ میں جمن میاں اپنی مخصوص آرام کرسی پر نیم دراز پیچوان سے شغل کرتے — اگر کوئی بھولا بھٹکا دوست آنکلتا تو پرانی یادیں تازہ ہو جاتیں۔ اور مہمان کی آمد تو عید سے زیادہ خوشی بخشتی تھی۔ لڑکیاں تو چار چھ ماہ کے بعد ماں باپ سے ملنے بھی چلی آتی تھیں۔ لیکن بیٹوں نے تو جانے کے بعد پلٹ کر خبر تک نہیں لی تھی۔ جمن میاں تو اس وقت کو کوستے تھے جب بیٹوں کو باہر جانے کی اجازت دی تھی۔

زندگی کے ڈھنگ بدلے تو خاندانی وراثت شکل بدل کر اس طرح سامنے آئی کہ پہچاننا مشکل ہو گیا۔ راجاؤں مہاراجاؤں کے عالیشان محل پانچ ستارہ ہوٹل میں تبدیل ہو گئے۔ یا انہیں میوزیم کی وشکل دے دی گئی۔ کئی پارٹیوں نے جمن میاں کو بھی حویلی فروخت کرنے پر اکسایا۔ اور انہیں خطیر رقم کا لالچ بھی دیا گیا —— لیکن وہ رضامند نہ ہوئے بلکہ انہیں تو ایسی پیشکش پر سخت غصہ آتا تھا — اور کچھ نہیں تو فلم کا کوئی یونٹ ہی آمرتا تھا کہ حویلی میں شوٹنگ کی اجازت دے دیں۔ انہیں رہ رہ کر بیٹوں پر بھی غصہ آتا تھا۔ جو گھر واپس آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اور سارے مسئلوں سے انہیں تنہا نمٹنا پڑ رہا تھا —

خدا خدا کر کے اظہر میاں اور مظہر میاں کو گھر کا راستہ یاد آیا — یاد بھی کہاں آیا، جمن میاں نے انہیں یاد دلایا کہ اس دنیا میں ان کا اپنا ایک گھر بھی ہے۔ جہاں بدنصیب والدین ان کے انتظار میں مر مر کے جی رہے ہیں۔ اظہر میاں انجینئر بن کر لوٹے۔ مظہر میاں نے

ڈاکٹری کا خیال چھوڑ دیا اور ایڈورٹائیزنگ اور فوٹو گرافی کے کئی کورس کر ڈالے — ان کا ارادہ اپنی — ایڈورٹائیزنگ کمپنی کھولنے کا تھا — دنیا کا سارا تجارتی نظام ہی اشتہاروں پر چل رہا تھا — اظہر ملٹی اسٹوری بلڈنگ کا منصوبہ لے کر آئے تھے — حویلی کا وسیع رقبہ ان کے خوابوں کی تعبیر بن سکتا تھا — ان کے حسابوں حویلی اتنی پرانی تھی کہ آج نہیں تو کل اسے گرنا ہی تھا۔ بس سارا مسئلہ باپ کو قائل کرنے کا تھا تھا — مظہر ان سے پوری طرح متفق تھے۔ انہیں بھی اپنی اشتہادی کمپنی کے لئے ایک شاندار آفس اور اسٹوڈیو کی ضرورت تھی — دونوں بھائی اس موضوع پر کئی بار تبادلہ خیال کر چکے تھے۔ کہ ایک دن ججن میاں نے خود ہی پوچھ لیا —

''صاحبزادے۔ کچھ اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچا ہے۔ آخر تمہارا ارادہ کیا ہے؟ —

''ارادہ تو بہت نیک ہے ابا۔ لیکن آپ کے تعاون کے بغیر کوئی ارادہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا — ''۔

''اب تک تم نے جو کچھ کیا وہ کیا میرے تعاون کے بغیر ہی کیا؟ — ججن میاں کو اس بات کا بے حد قلق تھا کہ بیٹوں کی باہر جانے کی ضد کی وجہ سے انہیں آموں کا باغ فروخت کرنا پڑا تھا — اپنے باغ کی دسہری اور لنگڑے کے سامنے سارے زمانے کے آم ہیچ تھے۔ آم کھانے کا مزہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ اب بیٹے مزید تعاون کے لئے زمین ہموار کر رہے تھے۔ ججن میاں نے یاد دلایا — ''ڈگری تمہارے پاس ہے یا آتے وقت اسے سمندر میں ڈبو آئے؟'' —

''محض ڈگری ہاتھ میں ہونے سے کیا ہوتا ہے ابا — جب تک عملی طور سے ڈگری کا استعمال نہ کیا جائے''

''کسی ملازمت کے لئے کوشش کرو میاں — تمہیں تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا'' —

''میں نوکری نہیں کروں گا۔'' اظہر میاں دھیرے دھیرے مطلب کی طرف آرہے تھے۔

''پھر کیا کرو گے؟'' — ججن میاں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''اپنا کام کروں گا''۔

میں امریکن طرز کی ملٹی اسٹوری بلڈنگ بنانا چاہتا ہوں۔ جس کے بیسمنٹ میں پارکنگ کا انتظام ہوگا۔ پہلی منزل پر دفتروں کے لئے عمارت ہوگی۔ کانفرنس ہال کی بھی سہولت ہوگی— باقی منزلوں پر رہائشی فلیٹس ہوں گے۔ پوری بلڈنگ ایرکنڈیشن ہوگی۔ لفٹ، بجلی اور پانی کا بھی معقول انتظام ہوگا۔ ایک بار یہ بلڈنگ بن جائے تو ہم کروڑ پتی ہو جائیں گے''—

اظہر میاں نے بڑے جوش سے اپنا منصوبہ سمجھایا—

''ماشاءاللہ۔ بڑا نیک خیال ہے۔ ایک بلڈنگ میں پورا شہر آباد ہو جائے گا''

مجن میاں نے بڑی سادگی سے طنز کیا— اظہر سمجھے کہ ابا ان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ خوش ہو کر بولے— ''بس سارا مسئلہ زمین کا ہے منصوبہ تو بڑا شاندار ہے''

مجن میاں سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بیٹے کی تمہید نے انہیں خطرہ سے آگاہ کر دیا۔

''آپ چاہیں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے''۔

''کہیں تمہارا ارادہ حویلی کی چھت پر اپنی بلڈنگ کھڑی کرنے کا تو نہیں ہے۔؟''—

مجن میاں نے بھرپور طنز کیا۔ اظہر کھسیا گئے۔

''ابا اگر ہم اپنی حویلی کی جگہ بلڈنگ بنائیں تو—؟''

''دیکھو میاں۔ ہر انسان کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ میری کمزوری یہ حویلی ہے۔ اور میں اپنی کمزوری سے کھلواڑ کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دوں گا''—

مجن میاں کے لہجے میں پتھروں جیسی سختی اور تلوار جیسی کاٹ تھی——

''سو سال پرانی یہ حویلی ہمیں کیا دے رہی ہے۔ اُلٹا ہر سال کئی ہزار روپے اس کی مرمت میں خرچ ہو جاتے ہیں۔''

اظہر نے قائل کرنا چاہا—

''جانتا ہوں''—

''اتنی بڑی حویلی خالی پڑی رہتی ہے۔ اور رہنے والے گنتی کے چند لوگ ہیں۔ میں آپ کے لئے جدید سہولتوں سے آراستہ بہترین فلیٹ بنواؤں گا''۔۔۔ اظہر نے گویا لالچ دیا۔۔۔

''نا میاں نا''۔۔۔ ججن میاں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس سے زیادہ سنناان کے بس سے باہر تھا۔۔۔

''ابا میرا منصوبہ۔۔۔۔'' اظہر بلبلائے۔

''بھاڑ میں گیا تمہارا منصوبہ۔ میری بلا سے تم مونگ پھلیاں بیچو۔ بس حویلی میں ہاتھ نہ لگانا۔۔۔

ججن میاں نے بات ختم کردی۔۔۔

'' کچھ تو کیجئے ابا پلیز!''۔۔۔ اظہر نے خوشامد کی تو ججن میاں نے خاموشی اختیار کی۔۔۔ اظہر بڑی امید سے باپ کی صورت دیکھ رہے تھے۔۔۔ بیٹے کی خوشامد سے وہ ذرا پسیجے۔۔۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ حویلی پر کدالیں چلانے کی اجازت دے دیتے۔ ''دیکھو میاں۔۔۔ اگر تمہارا دل چاہے تو حویلی کے پچھواڑے کی زمین۔۔۔ اصطبل اور شاگرد پیشہ اپنے کام میں لے سکتے ہو۔ وہ زمین بھی کم نہیں ہے''

اظہر نے اسی کو غنیمت جانا۔ اور گردن ہلا کر منظوری دے دی۔ جب سے ادھر سرکاری عمارتیں، رہائشی بنگلے۔۔۔ کالونی، پارک اور پختہ سڑکیں بن گئی تھیں۔ وہ علاقہ بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ ان کا لمبا چوڑا منصوبہ کچھ سکڑ گیا تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے حویلی کا خیال ہی چھوڑ دیا ہو البتہ اب انہوں نے اپنے منصوبے میں تھوڑی سی تبدیلی کرلی تھی۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ حویلی کی جگہ ایک شاندار ہوٹل بنائیں گے۔ ساتھ میں سوئمنگ پول۔۔۔ اور۔۔۔۔ اور بھی بہت کچھ۔۔۔ ابا کی زندگی میں تو یہ ناممکن تھا۔ اب وہ ایسے بھی ظالم نہیں تھے کہ باپ کے مرنے کی دعائیں مانگتے۔۔۔ لیکن مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔۔۔ سو ابا بے چارے بھی ایک دن راہئ ملکِ عدم ہوں گے۔

اظہر میاں کی بلڈنگ تعمیر کے مراحل میں تھی۔۔۔ ضرورت مندوں نے پیشگی رقم

دے کر اپنے حصّے کی بکنگ کروالی تھی۔ یہ ان کی پہلی بڑی کامیابی تھی — اور ان کے حوصلے آسمان چھو رہے تھے — البتہ اظہر میاں کی سرگرمیوں سے ججن میاں بالکل لاتعلق تھے۔

اس رات فضا میں سخت گھٹن تھی۔ حبس اتنا کہ ہوا کا نام نہیں تھا — اچانک ججن میاں کی آنکھ کھل گئی۔ اُنہیں اپنا پلنگ ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ انہوں نے گھبرا کر قریب سوئی ہوئی بیوی کا کاندھا ہلایا —

''بیگم — زلزلہ —'' اور پھر وہ بیوی کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آئے — اور چیخ چیخ کر بیٹوں کو آواز دی تو وہ بھی باہر آ گئے — ملازم بھی جاگ گئے۔ وہ سب حویلی کے صحن میں حیران و پریشان کھڑے تھے — بجلی بھی چلی گئی تھی — چاروں طرف گھور اندھیرا تھا — ہر طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عمارتوں کے گرنے کے دھماکے دل دہلا رہے تھے۔ گرد و غبار کا ایک طوفان سا اٹھا۔ اور زمین سے آسمان تک ایک سیاہ چادر سی تن گئی۔ اظہر اور مظہر نے ماں باپ کا ہاتھ تھاما اور حویلی سے باہر دوڑے ان کے عقب میں ملازمین بھی بھاگے۔ وہ سب حویلی سے دور کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے تھے۔ چاروں طرف آہ و بکا کا شور تھا — یا مکانوں کے گرنے کی آوازیں تھیں۔ ججن میاں دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے — بیگم انہیں تسلّی دے رہی تھیں — اظہر اور مظہر گم صم تھے —

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ ڈرے سہمے ہوئے لوگ اپنے گھروں کی طرف دوڑ پڑے۔ نہ جانے کتنے لوگ ملبے میں زندہ دفن ہو گئے تھے۔ کتنے ختم ہو گئے تھے — اور نہ جانے کتنے زخمی ہو گئے تھے —

''ابا چلیں'' — بیٹوں نے کہا — ججن میاں جیسے خواب میں ان کے ساتھ چل رہے تھے — حویلی کے قریب پہنچ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنا حوصلہ کہاں سے لاتے کہ حویلی کا ملبہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے —

''ابا — ابا'' مظہر نے باپ کو جھنجھوڑ ڈالا —

''ابا — ہماری حویلی سلامت ہے'' —

ججن میاں نے آنکھیں کھولیں۔ یہ خدا کی قدرت کا کرشمہ تھا یا ان کی نیکیوں کا

ثمر ــــ حویلی معجزاتی طور پر منہدم ہونے سے بچ گئی تھی ــــ نقصان ہوا تھا لیکن اتنا کہ اسے اتنے بڑے حادثے کا صدقہ ہی کہہ سکتے تھے۔ جمن میاں حویلی کے صحن میں ہی سجدے میں گر گئے ــــ

حویلی کے پچھواڑے زیرِ تعمیر بلڈنگ ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی ــــ اور میاں کی حویلی اس شان سے سر اٹھائے کھڑی تھی ــــ



گوشۂ عافیت

ساری عمر کرائے کے مکان میں گزارنے کے بعد رحمٰن صاحب کو اپنا گھر بنانے کا خیال کچھ اس طرح پریشان کرنے لگا کہ وہ بیوی بچوں سے صلاح مشورہ کئے بغیر ہی اپنے نقشہ نویس دوست اشتیاق حسین کے پاس پہنچ گئے اور ان سے اپنا مدعا بیان کیا۔ اشتیاق حسین ان کی بات سنتے ہی ہنس پڑے۔ ''رحمٰن بھائی! اگر میری بات مانیں تو اس جھنجھٹ میں نہ پڑیں۔ اتنی زندگی کرائے کے مکان میں گزاری ہے۔ چند برس اور سہی۔ یہ درد ِسر اپنے بیٹوں کے لئے رہنے دیں۔''

''دراصل مکان کی ضرورت بھی تو انہیں کے لئے رہے۔ ان کا شادی بیاہ ہوگا— تو ذرا آرام ملے گا۔ اس مکان میں تو اتنی گنجائش ہی نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہم نے تو جیسے تیسے گزار دی لیکن نئی نسل اس ڈربے میں گزارہ نہیں کر سکتی۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ شائستہ نے مجھ سے کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ بس اسے اپنا گھر بنانے کی بڑی تمنا ہے۔ جس کا اظہار وہ مجھ سے کئی بار کر چکی ہے۔ سو میں چاہتا ہوں کہ زندگی کے باقی دن آرام سے اپنے گھر میں کٹیں— اور میں اس سے سرخرو ہوسکوں''۔

''بھائی میرے— آپ کتنا ہی بڑا گھر بنوائیں لیکن جب بچے جوان ہوجاتے ہیں تو انہیں وہ گھر بھی مختصر معلوم ہونے لگتا ہے— دراصل اولاد کو ماں باپ کا وجود کھٹکنے لگتا ہے۔ دلوں میں گنجائش نہ رہے تو مکان کی وسعت بھی گھٹ جاتی ہے۔۔''

''آپ تو جانتے ہیں کہ میرے دونوں بیٹے کیسے سعادت مند اور فرمانبردار ہیں۔

لہٰذا آپ کے اندیشے درست نہیں ہیں۔ بہر حال میں نے شائستہ کے خوابوں کی تعبیر ایک مکان کی صورت میں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ بہت خوش ہوگی ابھی تک تو ہم بچوں کی تعلیم کی وجہ سے اپنا جی مارتے رہے ہیں۔ اب خدا کے فضل سے دونوں بیٹے کمانے لگے ہیں تو اخراجات کی فکر سے راحت نصیب ہوئی ہے"

"خیر بھائی— جیسی آپ کی خوشی۔ ورنہ میری رائے تو اس کے حق میں نہیں ہے"—

اشتیاق صاحب کو شاید تلخ تجربات نے اس رخ پر سوچنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ مگر ضروری تو نہیں تھا کہ سب ہی کو ناساز گار حالات کا سامنا کرنا پڑے— پھر رحمٰن صاحب کے دونوں بیٹے والدین کا بہت احترام کرتے تھے— اس لئے انہیں یہ وسوسہ نہیں ستاتا تھا کہ بیٹے کبھی ان سے بے رُخی برتیں گے۔

برسوں پہلے رحمٰن صاحب نے اپنے دوستوں کے کہنے سے ایک پلاٹ خرید لیا تھا— اس وقت وہاں آبادی کا نام ونشان نہیں تھا۔ ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ اور ویرانہ تھا۔ لیکن جس تیزی سے شہری آبادی پھیل رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ چند برس میں یہاں آبادی ہو جائے گی۔ ہوا بھی یہی۔ اب وہی ویرانہ ایک پر رونق اور پُر فضا علاقہ بن چکا تھا۔ ڈاکٹروں، انجینئروں کے بنگلے اور کوٹھیاں۔ آفیسرز کالونی۔ مارکیٹ، اسپتال، ڈاک خانہ، پارک، سنیما ہال، اسکول وغیرہ یہ سب دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ کبھی یہاں جنگل رہا ہوگا۔ رحمٰن صاحب کو تو گویا وہ پلاٹ پڑا مل گیا تھا۔ صرف زمین ہی کی قیمت کئی لاکھ ہو گئی تھی جسے انہوں نے بہت سستے داموں خریدا تھا۔ ورنہ شاید انہیں اپنا مکان بنانے کا خیال ہی نہ آتا۔

اشتیاق صاحب نے موقع پر جا کر پلاٹ کا معائنہ کیا تو انہیں بھی وہ جگہ بہت پسند آئی۔ سامنے پکّی سڑک تھی۔ ایک طرف ڈاکٹر بھاٹیہ کی دو منزلہ کوٹھی تھی— جس کے نچلے حصے میں ان کا کلینک تھا۔ اور اوپر کی منزل پر رہائش تھی۔ پلاٹ کے دوسری طرف پختہ لین تھی۔ جو آفیسرز کالونی تک جاتی تھی۔ اور لین سے متصل کشادہ پارک تھا۔ پشت پر بھی مکانوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ اور بقول رحمٰن صاحب کے، اس عمر میں انسان کو سکون سے زیادہ کسی چیز ضرورت نہیں ہوتی۔

اشتیاق صاحب نے بڑی محنت اور سوجھ بوجھ سے مکان کا نقشہ بنایا۔ فی الحال تو رحمٰن صاحب ایک ہی منزل بنوانا چاہتے تھے۔ لیکن ضرورت پڑنے پر دوسری منزل پر بھی حسب مرضی تعمیر کرانے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ فرمان اور کامران کو بھی نقشہ پسند آیا تھا۔ انہیں بس ایک بات پر اعتراض تھا پہلو کی گلی میں کھلنے والا چھوٹا کمرہ بے مصرف معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے بجائے باتھ روم کم لیٹرن بن جاتا تو باہری مہمانوں کو آرام رہتا۔ لیکن رحمٰن صاحب نے ہنس کر ان کے اعتراض کو ٹال دیا۔ اور نقشے کے مطابق مکان کی تعمیر شروع کروانا مناسب سمجھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں پی۔ ایف کی اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ اس لئے قرض وغیرہ کی لعنت سے بھی واسطہ نہیں پڑا۔ کچھ پیسے بچت کے بھی لگ گئے۔ جو کہ شائستہ بیگم کے سلیقے کی دین تھے۔ ورنہ رحمٰن صاحب خود تو بچت کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ فرمان کی انجینئری کی تعلیم پر کافی پیسہ خرچ ہوا تھا۔ کامران نے بی کام کیا تھا۔ خدا خدا کر کے اب رحمٰن صاحب کو اخراجات سے نجات ملی تھی۔ فرمان برج کارپوریشن میں انجینئر ہو گیا تھا۔ اور کامران ایک پرائیوٹ کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ رحمٰن صاحب کی پنشن کی رقم بھی اچھی خاصی تھی۔ شائستہ بیگم سلیقہ مند خاتون تھیں۔ انھوں نے کبھی چادر سے زیادہ پاؤں نہیں پھیلائے۔ اس لئے گھر میں کبھی پیسے کی ہائے ہائے نہیں مچی۔ اب تو انہیں مکان بنوانے کے بعد ایک ہی خواہش پوری کرنا تھا۔

بیٹوں کے سر پر سہرا سجانے کی آرزو ہر ماں کی طرح ان کے دل میں بھی پروان چڑھ رہی تھی۔ فرمان کی نسبت طے ہو گئی تھی۔ لڑکی خوبصورت اور تعلیم یافتہ تھی۔ متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ دان جہیز کا لالچ گھر میں کسی کو نہیں تھا۔ حالانکہ ان کے افسر فریدی صاحب نے بڑے بابو کے ذریعہ انہیں اپنی بیٹی کا پیغام خود بھجوایا تھا۔ وہ بیٹی کو نقد رقم کے علاوہ قیمتی جہیز اور کار وغیرہ بھی دینے کے لئے کہہ رہے تھے۔ لیکن لڑکی کی صورت شکل اچھی نہیں تھی۔ اور تندرستی میں بھی فربہی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ جبکہ فرمان کی بس ایک ہی شرط تھی کہ لڑکی خوبصورت ہو۔ اور رحمٰن صاحب کو بیٹے کی خوشی عزیز تھی۔ فرحین ان کے بیٹے کی پسند پر پوری اتری تھی۔ کامران ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال والدین کو اطمینان تھا کہ دو چار

سال میں ان کا گھر بھی سا دیں گے۔ بر سرِ روز گار لڑکوں کو زیادہ آزاد بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ کیا پتہ کب قدم بہک جائیں۔ اور کوئی بلا گلے پڑ جائے۔ اور ماں باپ کی برسوں کی محنت اور ریاضت خاک میں مل جائے۔

مکان بن کر تیار ہو گیا۔ دونوں لڑکوں کے لئے کشادہ کمرے۔ اٹیچڈ باتھ روم کے ساتھ تھے۔ ڈرائنگ روم، ڈائیننگ روم۔ رحمٰن صاحب اور شائستہ کے لئے کمرہ۔

دو برآمدے — کچن — دو اسٹور — گیرج — چھوٹا سا لان اور وہ پہلو والا مختصر کمرہ۔ جسے فی الحال انھوں نے مہمان خانہ کا نام دیا تھا۔ شائستہ بیگم کو اپنے خوابوں کی بڑی خوبصورت تعبیر ملی تھی۔ اور رحمٰن صاحب نے داخلی گیٹ کے پہلوؤں میں بنے ہوئے کھمبوں پر سنگِ مرمر کی تختیاں اپنے ہاتھ سے نصب کی تھیں جن پر 'شائستہ وِلا' سُرخ رنگ سے ابھرا ہوا تھا—

نئے گھر میں منتقل ہونے کے بعد رحمٰن صاحب نے فرمان کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی اور فرحین ان کی بہو بن کر آ گئی— شائستہ بیگم بہت خوش تھیں— خدا نے بڑے مختصر سے وقت میں انہیں کئی خوشیاں عطا کی تھیں۔ بقول شائستہ بیگم کے یہ گھر ان کے لئے بڑا بھاگوان ثابت ہوا تھا—

رحمٰن صاحب اپنے گھر کے مالک و مختار تھے تو شائستہ بیگم ایک اچھی منتظمہ تھیں۔ گھر کے اخراجات کا حساب کتاب رحمٰن صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن رائے مشورہ شائستہ بیگم سے لیا جاتا تھا— دونوں بیٹے ملازمت کے بعد سے اپنی تنخواہ کا زیادہ حصّہ باپ کے ہاتھ میں دیتے تھے— فرمان کی شادی ہوئی تو رحمٰن صاحب نے از خود وہ رقم آدھی کر دی تا کہ بیٹے کے ہاتھ میں زیادہ پیسے رہیں۔ اور وہ اپنی بیوی کے اخراجات کے لئے پریشان نہ ہو جبکہ اخراجات پہلے سے زیادہ بڑھ گئے تھے— ایک تو نئی بیاہی دلہن گھر آئی تھی۔ اس لئے ناشتے اور کھانے میں خاص اہتمام ہوتا تھا۔ پھر نئی رشتے داری تھی اس لئے مہمان داری کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا— کچھ اپنے اسٹیٹس کا بھی خیال تھا ورنہ پرانے والے گھر میں تو وہ لوگ بہت سادہ زندگی گزارتے تھے—

فرحین کے ہاتھ میں پہلی بار اتنی رقم آئی تو وہ بوکھلا گئی۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی ایسی زندگی کا تصور نہیں کیا تھا— خوبصورت سجا سجایا گھر۔ شوہر کی اچھی جاب، تفریح، شاپنگ— روزانہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سیر سپاٹے— وہ تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی— فرمان نے بھی نئی دلہن کی خوشی کے لئے دل اور پرس دونوں کے در وا کر دیئے تھے—

بیوی ایک چیز کی فرمائش کرتی تو وہ چار چیزیں خرید دیتا— لیکن چند مہینے میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ فرحین کے اخراجات— فضول خرچی کی حد پار کرتے جا رہے ہیں۔ کپڑوں سے الماری لبالب بھری تھی— سنگار میز پر کاسمیٹکس کے ڈھیر لگے تھے— سینڈل، پرس، چوڑیاں اور الم غلم کا بازار لگ گیا تھا۔ پھر بھی فرحین کی ہوس پوری نہیں ہوتی تھی— سنیما جاتی تو قریبی مارکیٹ سے کچھ نہ کچھ خرید لیتی— کچھ پسند آ جاتا تو بلا ضرورت لے آتی۔ اس روز بھی وہ شاپنگ کے لئے جانا چاہتی تھی— نئی ساڑی سے میچ کرتی لپ اسٹک اور نیل پالش لینا تھی۔ جبکہ درجنوں شیڈز پہلے سے موجود تھے— فرمان نے اس کی فضول خرچی پر روک لگانا ضروری سمجھا—

''فرحی! تمہارے پاس ہر شیڈ کی لپ اسٹک اور نیل پالش ہے۔ تم دیکھو تو سہی۔ ساڑی سے میچ کرتا شیڈ ضرور مل جائے گا

فرمان نے رسان سے کہا—

''میں سارے شیڈ ٹرائی کر چکی ہوں فرمان لیکن کیا کروں کم بخت میچنگ شیڈ ہی نہیں ہے''—

''کوئی بات نہیں۔ کسی ملتے جلتے شیڈ سے کام چلا لو''۔

''مجھے کل عاشی کی سالگرہ میں وہی ساڑی پہننا ہے فرمان— بھلا اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟''

''اس لئے کہ اب میرے پاس پیسے نہیں ہیں''—

''ہائے اللہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ابھی تو آدھا مہینہ باقی ہے۔ آخر سارے پیسے کیا ہوئے؟''—

''میں نے حساب تو لکھا نہیں ہے جو بتاؤں کہ کیا ہوئے۔ بہر حال خرچ ہو گئے۔۔۔
مجھ سے زیادہ تو تمہیں اس بات کا اندازہ ہونا چاہئے''۔۔۔ فرمان نے دکھائی سے کہا۔۔۔
''عاشی کو تحفہ بھی تو دینا ہوگا۔ آپ ابّو سے پیسے لے لیں نا۔ فرحین نے لجاجت سے کہا۔۔۔

''دیکھو فرحی۔۔۔ ابّو سے پیسے مانگنے کا کوئی تُک نہیں ہے۔ انہوں نے پہلے ہی ہمارے اخراجات کے خیال سے وہ رقم آدھی کر دی ہے جو میں شادی سے پہلے انہیں دیتا تھا۔ جبکہ گھر کے اخراجات بڑھ گئے ہیں۔''فرمان نے تلخی سے کہا۔۔۔

''کامران کی تنخواہ کیا ہوتی ہے؟''۔۔۔ پھر ابّو کی پنشن بھی ہے''

''کامران کی تنخواہ میں ہی گھر کا خرچ چلتا ہے۔ ورنہ ابّو کی پنشن سے بھلا کیا ہوتا ہے؟۔۔۔ مجھے تو پہلے سے زیادہ پیسے انہیں دینا چاہئے تھے۔۔۔ لیکن۔۔۔''۔

''خیر اب اس وقت سارا حساب کتاب رہنے دیں اور کہیں سے بھی انتظام کریں۔۔۔ یہ میری عزّت کا سوال ہے شادی کے بعد یہ میرے میکے کی پہلی تقریب ہے۔ میں سب کے سامنے آپ کی سبکی نہیں کراؤں گی''۔۔۔

مجبوراً فرمان کو نئی نویلی دلہن کی بات ماننا پڑی اس نے ابو سے دو سو روپے قرض کے نام سے مانگے تو وہ ہنس پڑے۔

''بیٹا! باپ اور بیٹے میں قرض کا لین دین نہیں ہوتا۔ تم یہ پیسے لے جاؤ۔ لیکن اپنے اخراجات پر ابھی سے کنٹرول کرو۔ ورنہ آگے چل کر تم کو ہی پریشانی ہوگی''۔۔۔

فرمان کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ اس نے آئندہ محتاط رہنے کا عہد کیا۔ لیکن فرحین کی ضد اور فرمائشوں کا سلسلہ روز بہ روز دراز ہوتا گیا۔ اور اسے ہر ماہ باپ سے دو چار سو روپے مانگنا پڑتے۔

حسبِ دستور مہینے کی تین تاریخ کو فرمان نے باپ کو ایک ہزار روپے دئے تو انھوں نے واپس کر دئے۔

''ابّو آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' فرمان نے آہستہ سے کہا۔۔۔ رحمٰن صاحب نے

سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں بیٹا۔ ناراض نہیں ہوں۔ لیکن میں تمہیں اور بہو کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ضرور دلانا چاہتا ہوں۔ اس ماہ سے تم اپنا کچن الگ کر لو۔ میں نے شائستہ سے کہہ دیا ہے کہ کچن تمہارے حوالہ کر دیں۔ ہم اسٹور میں اپنا کچن سیٹ کر لیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری تنخواہ تم دونوں کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کو سلیقے سے خرچ کرو۔ یوں بھی اب شائستہ سے اتنا کام نہیں ہوتا''۔

رحمٰن صاحب نے بڑی خوبصورتی سے فرمان کی گرہستی الگ کر دی۔ فرمان بھلا کیا کہتا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ باپ کا فیصلہ بہت مناسب ہے۔ اس طرح کم از کم بیگم صاحبہ کی یہ شکایت تو دور ہو گی کہ شوہر والدین کو ہر ماہ ایک موٹی رقم دے کر خود خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔

فرمان نے پوری تنخواہ بیوی کے سامنے رکھ دی۔ فرحین نے پیسے گنے تو خوش ہو گئی۔ چہک کر بولی۔

''یہ اتنے پیسے؟ کیا آپ کی تنخواہ بڑھ گئی ہے؟''

''''یہی سمجھ لو۔ تمہیں ابو کو پیسے دینا بہت کھلتا تھا نا۔ سو انھوں نے پیسے واپس کر دئے۔ لیکن تمہیں اپنی گرہستی خود سنبھالنا ہو گی۔ کچن کے سامان کی لسٹ بنا دو''۔

''۔ لیکن اس میں پورے مہینے کا خرچ کیسے پورا ہو گا؟''۔ فرحین بوکھلا گئی۔ وہ تو پورا مہینہ بے فکری سے خرچ کرنے کی عادی تھی۔

''کیوں نہیں ہو گا۔ ابو کو ایک قلیل رقم دی جاتی تھی اور وہ اس میں ہم دو لوگوں کو پورا مہینہ کھلاتے تھے تب تمہیں وہ پیسے بہت لگتے تھے۔ اب کیا ہو گیا؟۔ اوپر سے دو چار سو ہر ماہ واپس بھی لے لیتے تھے۔ بہر حال یہ تمہارا دردِ سر ہے۔ تم جانو۔ ویسے بھی ہم کب تک ان کے سہارے رہتے۔ اپنی گھرواری اپنی ہی ہوتی ہے۔''

فرمان نے اس کے کہے ہوئے الفاظ اسے واپس لوٹا دئے اور باتھ روم میں گھس گیا۔ فرحین تو بری پھنسی تھی۔ وہ اب پچھتا رہی تھی کہ ناحق اس نے اپنی اچھی بھلی زندگی کو عذاب بنا لیا مزے سے گذر رہی تھی۔ آزادی تھی، کوئی فکر نہیں تھی۔ اب چولہا ہانڈی کے

علاوہ پورے مہینے گرہستی کی گاڑی کھینچنے کا بھی مسئلہ تھا۔۔۔

اٹھتے بیٹھتے شائستہ بیگم نے میاں سے کامران کی شادی کرنے کا تقاضہ کیا تو ایک دن رحمٰن صاحب نے کامران کو پکڑا۔۔۔ اور اپنی تیز ماں کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ نیم رضا مند تو نظر آیا لیکن باپ سے کھل کر بات نہ کر سکا۔ اور ماں کی مدد کا طالب ہوا۔۔۔

''امی میں شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن لڑکی میری پسند کی ہوگی۔۔۔ باقی سب کچھ آپ کی پسند سے ہوگا۔ یعنی جس طرح چاہیں شادی کر دیں۔۔۔''

کامران نے بری لجاجت سے ماں سے دل کی بات کہہ دی۔ شائستہ بیگم مسکرانے لگیں۔۔۔

''کون ہے وہ لڑکی؟''۔۔۔

''ہماری کمپنی کے جوائنٹ ڈائریکٹر کی بیٹی ہے۔ منزہ۔ بہت اچھی لڑکی ہے''۔۔۔

''بیٹا! اس کا باپ اتنے بڑے عہدے پر ہے۔ یقیناً وہ لوگ بے حد رئیس ہوں گے۔ ہمارا ان کا کیا مقابلہ؟''۔۔۔

''امی وہ لوگ مال دار ہونے کے ساتھ بہت آزاد خیال ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کی مرضی اور خوشی کو زیادہ مقدم سمجھتے ہیں۔۔۔ انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے''۔۔۔

''سوچ لو بیٹا۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم دونوں کو پچھتانا پڑے۔ شادی اپنے برابر والوں میں ہی اچھی رہتی ہے۔''۔۔۔

شائستہ بیگم نے اندیشہ ظاہر کیا۔۔۔

''امی میں کئی سال سے منزہ کو جانتا ہوں۔۔۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بس آپ اور ابو کسی دن باقاعدہ پیغام لے کر جائیں اور تاریخ پکی کر لیں''۔۔۔

شائستہ بیگم سمجھ گئیں کہ دو دل راضی والا معاملہ ہے۔ اس لئے منزہ کی خامیاں اور کمزوریاں بھی کامران کو خوبیاں نظر آ رہی ہیں۔ یا پھر اس نے ایسا تاثر دیا ہوگا جو کامران اس کو اپنے لئے موزوں سمجھ رہا ہے۔ بہر حال یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ وہ کیسی بہو اور شریکِ حیات ثابت ہوگی۔ انہیں تو ہر حال میں بیٹے کی خوشی عزیز تھی۔ سو انہوں نے میاں کو

کامران کی پسند کے بارے میں بتایا ساتھ ہی اس کی پرزور حمایت بھی کی۔۔۔ رحمٰن صاحب صرف بیوی کی صورت دیکھ کر رہ گئے۔۔۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔۔۔

منزہ دلہن بن کر 'شائستہ ولا' میں آ گئی۔ چند دن تو گہما گہمی، دعوتوں اور سیر سپاٹوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر دولہا دلہن ہنی مون منانے کشمیر چلے گئے۔ دو ہفتے کے بعد واپس آئے تو چند روز منزہ میکے میں رہی۔۔۔ کامران بھی اس کے ساتھ ہی مہمان داری کا لطف اٹھا رہا تھا۔ ابھی تک منزہ کا جہیز سسرال سے نہیں آیا تھا۔ اب منزہ سسرال آئی تو ساتھ میں ٹرک بھر کر جہیز کا سامان بھی آیا۔ اور چم چم کرتی نئے ماڈل کی کار گیرج میں نظر آنے لگی۔۔۔

منزہ نے آتے ہی پورے گھر کی سیٹنگ بدل دی۔ ڈرائینگ روم نئے سرے سے آراستہ کیا۔ پرانا صوفہ سیٹ فرمان کے کمرے میں پہنچ گیا کیونکہ وہ فرحین کے جہیز کا تھا۔ ڈرائینگ روم بہت کشادہ تھا۔ اسے پلائی ووڈ کا پارٹیشن لگا کر دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور ایک حصّے میں منزہ نے اپنی ڈائننگ ٹیبل فریج اور کراکری کی الماری سجا دی۔ بیڈ روم تو خیر اپنا الگ تھا ہی۔ البتہ اب اسے نئے ڈھنگ سے سیٹ کیا۔۔۔

شائستہ بیگم نے اسٹور میں کچن کا سامان لگا لیا تھا۔ اور اپنا کچن فرحین کو دے دیا تھا۔ منزہ نے اسٹور کا سامان برآمدے میں رکھوا دیا اور اسے نئے طرز کے کچن میں تبدیل کر دیا۔ فٹافٹ خانساماں بھی آ گیا۔ اور نیا کچن چینی، ولائیتی ڈشوں کی خوشبو سے مہکنے لگا۔۔۔ ایسے میں بھلا شائستہ بیگم کے پکائے ہوئے کھانوں کی کیا اہمیت تھی۔ انھوں نے اپنے کمرے میں ہی ایک طرف پکانے ریندھنے کا سامان ترتیب سے رکھ لیا۔ اور اپنا اور میاں کا کھانا پکانے لگیں۔۔۔

اس طرح بغیر کسی ترشی اور ناراضگی کے منزہ کی گرہستی روزِ اوّل ہی سے الگ ہوگئی۔ اور منزہ کے حُسنِ انتظام نے والدین کو بیٹے سے جدا کر دیا۔ مہینے کے شروع میں کامران نے باپ کو کچھ پیسے دینا چاہے تو انھوں نے رسان سے سمجھا دیا "بیٹا۔۔۔ میری پنشن ہم دونوں کے لئے کافی ہے۔ تمہاری ابھی نئی نئی گرہستی ہے۔ اس لئے تمہیں ان پیسوں کی زیادہ ضرورت ہے" کامران کے دل پر چوٹ تو لگی لیکن حالات نے اسے خود ہی سمجھا دیا تھا

کہ منزہ کے طرزِ عمل کے بعد والدین سے کچھ کہنا مناسب نہیں۔ وہ گھر جہاں رحمٰن صاحب کی حکومت تھی ان کے ہاتھ سے اب نکل چکا تھا — اس لئے۔ ایک دن جب منزہ کو کامران سے بحث کرتے سنا تو وہ کچھ اور سمٹ گئے۔ اور گلی کے رخ کھلنے والا چھوٹا کمرہ صاف کرا کے مع بیوی اور اپنے مختصر سے سامان کے اس میں منتقل ہو گئے — یہی نہیں انہوں نے گھر کے اندر کھلنے والی کھڑکیاں اور دروازے بھی بند کر دیئے تاکہ گھر کے مکینوں سے ان کا کوئی تعلق باقی نہ رہے —

منزہ کو یہ شکایت تھی کہ اتنا بڑا کمرہ دو بوڑھی جانوں کی ضرورت سے بہت زیادہ ہے — جبکہ اس کا سامان اتنا ہے کہ بیڈ روم مال گودام معلوم ہوتا ہے — اور اس کا وہاں دم گھٹتا ہے۔

"شائستہ! تمہیں یاد ہے نا کہ دونوں لڑکوں نے اس چھوٹے کمرے کو بالکل فضول بتایا تھا۔ اور اس کی سخت مخالفت کی تھی — ؟

رحمٰن صاحب نے بیوی کو یاد دلایا۔

"ہاں — سب کچھ یاد ہے"۔

انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا — اور آنکھوں میں آئی نمی کو ڈوپٹے کے آنچل سے صاف کیا —

"اشتیاق صاحب نے نقشہ بناتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا تھا۔ انہوں نے کہا تھا —

"رحمٰن بھائی! اتنے بڑے گھر میں ایک گوشۂ عافیت اپنے لئے ضرور رکھئے۔ تاکہ جب لڑکوں کو اپنی فیملی کے لئے یہ گھر تنگ معلوم ہو تو آپ یہاں رہ سکیں۔ کیونکہ ایک وقت زندگی میں ایسا بھی آتا ہے جب والدین خود کو سمیٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں — اور گھر میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی —

اس وقت "شائستہ ولا" کی تعمیر کو صرف تین سال ہوئے تھے — اور شائستہ بیگم کے تیس برسوں کے خوابوں کی تعبیر —— یہ گوشہ تھا —

☆☆

تماشہ نہ ہوا

رات اندھیری تھی۔ سناٹا اتنا شدید تھا کہ مکانوں میں سوئے ہوئے انسان خود کو قبر کی اتھاہ گہرائیوں میں مدفون سمجھ رہے تھے۔ خدا جانے اس رات سڑکوں اور گلیوں میں بھونکنے والے کتوں کو کیا ہو گیا تھا۔ ورنہ ہر رات تو ان کے بھونکنے سے سب کی نیند حرام ہو جاتی تھی —— لیکن زندگی کا احساس تو باقی رہتا تھا — ہوا کی سرسراہٹ بھی ایسی پراسرار تھی جیسے کوئی دبے پاؤں گذر رہا ہو۔ دہشت اور خوف اگر دل میں پاؤں پھیلا کر بیٹھ جائے تو ہر آہٹ پر لوگ چونک اٹھتے ہیں۔ وہی لوگ جو دن کو ہنستے بولتے تھے — ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے تھے، رات ہوتے ہی اپنے گھروں میں دبک جاتے تھے — طوفان تو آ کر گذر بھی گیا تھا۔ لیکن اپنے نشان ضرور چھوڑ گیا تھا۔ اور ہر نشان حرفِ غلط نہیں ہوتا کہ وقت کہ ساتھ مٹ جائے۔ کچھ نقش دیرپا ہوتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں صدیوں کے انقلاب بھی نہیں مٹا سکتے۔ ہر چہرہ تاریخ کا ورق بن جاتا ہے۔ اور ہر دل لوحِ مزار ——

رات کے سناٹے کو اچانک ایک کمزور سی آواز نے توڑ دیا۔ اور سونے والے بستروں میں اس طرح اُچھلے جیسے کہیں نزدیک بم پھٹ گیا ہو۔ رضائیوں میں منہ چھپائے وہ اس آواز کو سن کر بھی نہیں سن رہے تھے۔ ایک ننھی سی چیخ۔ ایک کمزور سی آواز بھلا کسی کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ لیکن یہ آواز تنہا تو نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ ماں ہوگی۔ یا پھر باپ ہوگا۔ اب دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کا زمانہ بھی تو نہیں رہا۔ خواہ مخواہ کوئی مصیبت گلے پڑ جائے۔ سب لوگ اپنے بستروں میں دُبکے تھے۔ اور اس آواز کی نفی کر رہے تھے —— جو

ان کی سماعتوں میں نیزہ کی انی کی مانند چبھ رہی تھی۔

''اے جی سنتے ہو؟ — شاہدہ نے میاں کو پکارا —

''اوں — اوں'' — سونے دو یار''۔

میاں تو پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ صور اسرافیل بھی پھونکا گیا تو اس وقت اسے بھی سننے سے انکار کر دیں گے۔ یہ تو ایک بچہ کی آواز تھی —

''سونے کے لئے پوری رات پڑی ہے۔ باہر گلی میں کوئی بچہ رو رہا ہے۔ اتنی سردی ہے خدا جانے کوئی اس کے پاس ہے بھی یا پھر کوئی جان بوجھ کر اسے یہاں ڈال گیا ہے'' —

شاہدہ نے ذرا دیر میں بہت کچھ سوچ لیا۔ لیکن صفدر ٹس سے مس نہ ہوا تو اس نے اس کا شانہ ہلا دیا —

''ہو گا کوئی تمہیں کیا؟'' صفدر جھلا گیا —

'' — اور جو غریب ٹھنڈ میں اکڑ کر مر گیا تب'' —

شاہدہ نے خوف سے جھرجھری لی —

''صبح جو دیکھے گا۔ معاملہ خود ہی سنبھالے گا''

''اچھا۔ تم اس انتظار میں ہو کہ کسی طرح رات گذرے اور کوئی آ کر بچہ کی لاش میونسپلٹی والوں کے حوالے کر دے کہ کچرا اٹھا لے جاؤ۔ ہماری گلی نہ سڑے۔ بس'' —

شاہدہ مارے غصے کے بستر سے اتر آئی۔ صفدر نے تلملا کر پوچھا —

''آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟''

''بس اتنا کہ بچہ اور اس کی ماں کو ہم رات بھر کے لئے اپنے گھر کے کسی گوشے میں پناہ دے دیں۔ ورنہ بیچارے اس سردی میں اکڑ کر مر جائیں گے''۔

شاہدہ نے سلیپر پہنے۔ شال لپیٹی۔ کھٹ کھٹ ساری بتیاں روشن کیں اور گلی میں کھلنے والے دروازہ کی چٹخنی گرا دی —

''صفدر ٹارچ لاؤ۔ سامنے تو کوئی نظر نہیں آ رہا ہے'' —

شاہدہ نے آواز کی سمت نظریں دوڑائیں۔لیکن اندھیرے میں بھلا کیا دکھائی دیتا۔۔۔صفدر ٹارچ لے کر آگیا۔وہ دونوں ٹارچ کی روشنی ادھر اُدھر ڈالنے لگے۔اور پھر روشنی کا دائرہ ایک گٹھری پر مرکوز ہو گیا۔شاہدہ لپکی اور اس نے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے بچّہ کو گود میں لے لیا۔آس پاس تو کیا۔دور، دور تک کوئی نہیں تھا۔۔۔بچّہ تنہا پڑا تھا۔اور اب روتے روتے تھک کر سو گیا تھا۔

''ظالم، سنگ دل، شاہدہ نے دل ہی دل میں اس کے ان دیکھے ماں باپ کو باتیں سنائیں۔اور بچّہ کو گرم شال میں لپیٹ لیا۔جس کا بدن برف ہو رہا تھا اور ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔۔۔ کئی مکانوں کی بتیاں جلیں۔۔۔اور دھڑ دھڑاک کر کے کئی دروازے کھل گئے۔کچھ مرد گھروں سے باہر نکلے۔عورتوں نے دروازہ کی اوٹ سے جھانکنے پر اکتفا کی۔سب کی آنکھوں میں شکوک کے سائے لرزاں تھے۔اور ہونٹوں پر سوال مچل رہے تھے۔۔۔پنڈت جی اور خان صاحب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سوال کیا۔۔۔

''یہ بچّہ کس کا ہے؟''۔۔۔

''ہمیں کیا معلوم۔ہم تو اس کے رونے کی آواز سن کر باہر آئے تھے۔۔۔ آپ لوگوں سے تو اتنا بھی نہ ہوا''۔۔۔

صفدر نے تلخی سے کہا۔وہ یہ سوچ کر جل گیا تھا کہ ابھی تک تو سب مرے پڑے تھے۔۔۔اب ہماری آوازیں سنیں تو زندہ ہو گئے۔شاہدہ نے بہت حلیمی سے کہا۔۔۔ہم بڑی دیر سے اس کے رونے کی آواز سن رہے تھے جب نہ رہا گیا تو دیکھنے چلے آئے کہ معاملہ کیا ہے؟''۔۔۔

''بچّہ اکیلا ہے؟'' مرزا صاحب نے سوال کرنا ضروری سمجھا۔۔۔

پنڈت جی نے مرزا صاحب کو لتاڑا۔۔۔

''دیکھ تو رہے ہو مولانا کہ بچّہ کو یہاں لا کر کوئی پھینک گیا ہے۔رام رام کیسا جمانہ آگیا ہے''۔۔۔

''اب اس کا کیا کرو گے شاہد میاں؟''۔۔۔

خان صاحب نے پوچھا۔مرزا صاحب پھر بولے۔۔۔

''پولس میں دے دو—ورنہ خواہ مخواہ کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی''

''آپ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں رات کے دو بجے ہم اسے پولیس میں دینے جائیں گے۔ یہ غریب پہلے ہی سردی کھا چکا ہے۔ ادھر سے اُدھر کیا گیا تو مر جائے گا بیچارہ''

شاہدہ پھٹ پڑی—

''اور کوئی مصیبت آئی تب؟''

''اگر ایک بچے پر ترس کھانا اور جان بچانا مصیبت ہے تو یہی سہی۔ میں بچّہ کو اپنے پاس گھر میں رکھوں گی۔ آپ سے گواہی نہیں دلواؤں گی''

شاہدہ نے جل کر کہہ دیا۔ صفدر کو بھی غصّہ آ گیا۔

''آپ لوگوں میں سے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ ہمیں کچھ لینا دینا نہیں ہے''—

''بھگوان جانے یہ کس ذات اور دھرم کا ہے ہمیں اپنا دھرم بھرشٹ نہیں کرنا ہے''—

پنڈت جی نے جینو کو ہاتھ لگایا۔ خان صاحب نے زور سے لاحول پڑھا۔ اور مرزا صاحب منہ ہی منہ میں کچھ بُد بُدا کر رہ گئے۔

''یہ پاپ کی گٹھری آپ ہی کو مبارک ہو''—

کسی نے ہانک لگائی—

''یہ پاپ کی گٹھری ہو یا ثواب کی۔ میں اسے اپنے پاس رکھنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ لوگ بیکار ہی اپنا دماغ کھپا رہے ہیں۔ جایئے اور کانوں میں روئی ٹھونس کر سو جایئے''

شاہدہ نے تلخی سے کہا۔ اور بچّہ کو لے کر گھر میں چلی گئی۔ صفدر بھی غڑاپ سے اندر آ گیا۔ اور دروازہ بند کر لیا۔

''ہم نے تو اونچ نیچ سمجھا دی۔ آگے یہ جانیں ان کا کام۔ کوئی ماں ایسے ہی تو اپنے جگر کا ٹکڑا نہیں پھینکے گی؟—''

خان صاحب نے پتے کی بات کہی— سب نے تائید میں سر ہلایا۔ اور اپنے اپنے

گھر ہو لئے۔

صفدر نے اس سارے تماشے کا خاطر خواہ اثر لیا۔ اور شاہدہ پر برس پڑا۔
صبح اسے تھانے میں دینا یا کسی اناتھ آلیہ کے حوالہ کر دینا۔ لیکن یہ یہاں نہیں رہے
گا۔"۔

"میں نے کب کہا کہ یہ یہاں رہے گا۔؟ قسمت میں اولاد کی سکھ ہوتا تو میری کوکھ کیوں بنجر ہوتی؟" شاہدہ نے رسان سے کہا۔ اور بچہ کو ہیٹر کے قریب لٹا دیا۔ اور پھر دودھ گرم کر کے لائی اور چمچ سے اُسے پلانے لگی۔ پیٹ کی آگ بجھی۔ اور بدن کو گرمی ملی تو بچہ آرام سے سو گیا۔ شاہدہ نے اس پر کمبل ڈال دیا اور خود بھی اس کے پاس ہی لیٹ گئی۔

محلّہ والے سویرا ہوتے ہی شاہدہ کے دروازہ پر جمع ہو گئے۔ اس وقت مجمع کچھ زیادہ ہی تھا۔ جن لوگوں نے رات والا تماشہ نہیں دیکھا تھا وہ مارے شوق اور تجسس کے بے حال ہو رہے تھے۔ اور رات والے تماشائی نمک مرچ لگا کر سارا قصہ سنا رہے تھے۔

صفدر اور شاہدہ دیر سے آوازوں کی بھنبھناہٹ سن رہے تھے۔ لیکن سونے کی اداکاری کرر رہے تھے۔ جب کسی نے دروازہ پیٹا تو ناچار صفدر کو بستر چھوڑنا پڑا۔ ناگواری سے دروازہ کھولا تو نظر خاکی وردی والے پر پڑی۔ دیکھ کر موڈ سخت حراب ہوا۔ اللہ جانے تھانے سے بلایا گیا تھا۔ یا راستہ چلتے پکڑ لائے تھے۔ سپاہی نے سخت لہجہ میں پوچھا۔

"وہ بچہ تمہارے پاس ہے؟"۔

"کیا وہ آپ کا بچہ ہے؟"۔

صفدر نے حوش ہو کر سوال کیا۔ سپاہی اس بے ہودگی پر تلملا ہی تو گیا۔ ڈانٹتے ہوئے بولا۔

کیا تم کو پتہ نہیں کہ اس طرح کوئی چیز اٹھانا جرم ہے تمہیں سزا بھی ہو سکتی ہے"۔

"وہ کوئی 'چیز' نہیں ہے بچہ ہے۔ جیتا جاگتا بچہ۔ اور اگر میں اسے نہ اٹھاتا تو سردی سے اکڑ کر مر جاتا۔ تب تمہارا قانون کیا کہتا؟"۔

"بکو نہیں۔ اور میرے ساتھ تھانے چلو۔ وہاں سب معلوم ہو جائے گا"۔

''۔۔۔۔اور اگر میں نہ چلوں؟''صفدر مسکرایا۔۔۔

''صفدر ان کے منہ لگنا بیکار ہے اندر آ جاؤ''۔۔۔

شاہدہ نے صفدر کا ہاتھ تھام کر اس سے کہا۔لیکن صفدر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔۔۔

''اے مسٹر! مجھے قانون نہ پڑھاؤ کیونکہ میں بھی دس برس سے وکالت کر رہا ہوں۔اور دن رات قانون کے درمیان رہتا ہوں۔سمجھے؟''۔۔۔

''دیکھئے اگر آپ اس بچّے کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں تو ویسا کہیں۔۔۔میں سب معاملہ فٹ کر دوں گا''۔۔۔

سپاہی نے رازداری سے کہا۔۔۔

''کتنے میں معاملہ فِٹ ہوگا؟''صفدر کو تفریح سوجھی۔۔۔

''زیادہ نہیں بس ایک ہزار دے دو''۔۔۔

''یہ تو بہت ہیں۔کچھ کم کرو بھائی''۔۔۔

''پانچ سو۔۔۔اب تول مول نہ کرنا''۔۔۔

''بس پچاس روپے ملیں گے۔بتاؤ کیا کہتے ہو؟''

''چلو پچاس ہی سہی۔۔۔''سپاہی نے کچھ نہ ملنے سے کچھ ملنا بہتر سمجھا کہ اسی وقت قریبی گلی سے ایک عورت نکلی اور مجمع کو نظر انداز کر کے ادھر اُدھر کچھ تلاش کرنے لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہے پگلی؟''کسی نے پوچھا۔۔۔

''بچّہ۔۔۔میرا بچّہ''۔۔۔اور پھر بچّے کی رونے کی آواز سن کر وہ تیر کی مانند اندر گئی اور بچہ کو اٹھا کر باہر آ گئی۔۔۔

''ارے۔۔۔یہ تو اس پگلی کا بچّہ ہے''۔۔۔ کئی لوگوں کے منہ سے نکلا۔پگلی نے بچّہ کو اپنی چھاتی سے لگایا اور ایک طرف بیٹھ کر اسے چومنے چاٹنے لگی۔وہاں موجود سب لوگوں کے چہرے لٹک گئے۔۔۔سپاہی نے دل میں پگلی کو گالی دی اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆

پرانے چراغ

''بشیر کی ماں —— یہ بشیر کہاں ہے؟''

رفیق میاں باہر سے آرہے تھے۔ گرمی سے ان کا برا حال تھا۔ تخت پر نڈھال سے ہو کر لیٹ گئے۔ اور کھجور کی پنکھیا جھلنے لگے۔ بیٹا نظر نہیں آیا تو فکر مند ہو گئے

''—— اور کہاں ہو گا —— نیستی کا مارا پلنگ کے بان توڑ رہا ہے۔ ابھی اس کی صُبو (صبح) کہاں ہوئی ہے؟''

اماں نے روٹی توے سے اتاری اور ایک قہر بھری نگاہ دالان میں سوئے ہوئے بیٹے پر ڈالی اور منہ ہی منہ بڑبڑانے لگی۔ ''دس بجنے کو آئے اور لاٹ صاحب کی نیند ابھی پوری نہیں ہوئی۔''

ماں باپ کی آوازوں سے بشیر کی نیند میں خلل پڑا تو اس نے تکیہ منہ پر رکھ لیا۔ لیکن نیند تو اچاٹ ہو چکی تھی —— جل کر تکیہ الگ پھینکا اور نل پر چلا گیا —— منہ پر پانی کے چھپاکے مارے گیلے ہاتھوں سے جھوا بھر بالوں کو برابر کیا۔ اور باورچی خانے میں گھس گیا۔

''لا اماں چائے دے۔ بک بک کر کے نیند خراب کر دی'' اماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور گھنٹہ بھر پہلے کی رکھی دھری چائے گرم کرنے لگی۔ بشیر نے ہاتھ بڑھا کر پٹرے سے مگ اتارا۔ گھما پھرا کر دیکھا۔ اور زور سے زمین پر رکھ دیا۔

''اس گھر میں تو کوئی مگ تک ثابت نہیں ہے۔ سب کے کنڈے ندارد ہیں۔ چائے پینے کو من نہیں کرتا''

وہ رہا سامنے بازار۔ جا کر ایک درجن مگ خرید لا — اور آرام سے دن رات چائے پی۔ لاٹ صاحب کو ٹوٹے ہوئے مگ تو نظر آتے ہیں لیکن گھر کی پریشانی دکھائی نہیں دیتی شکر کر بنا ہاتھ پاؤں چلائے کھاتے کو مل رہا ہے اور تجھے نوابی سوجھی ہے‘‘۔

اماں نے چائے مگ میں ڈالی۔ بشیر نے گرم گرم روٹی ڈلیا سے اٹھائی اور چائے کے ساتھ کھانے لگا۔ دو روٹیاں کھا کر وہ کھڑا ہو گیا۔

’’روز حلق تک ٹھونس کر نکل جاتا ہے۔ اور سارا دن آوارہ گردی کرتا ہے — کوئی کام دھام نہیں ملتا تجھے‘‘ —

’’نہیں ملتا — کیا کروں؟ چوری کروں یا کہیں ڈاکہ ماروں؟‘‘

’’کچھ بھی کر اب تیرا باپ گھر کا خرچ نہیں چلا سکتا۔ تو اب اتنا نادان نہیں ہے کہ گھر کی حالت نہ سمجھے‘‘ —

بشیر نے کپڑے بدلے — آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارے۔ کنگھا جیب میں رکھا اور گنگناتا ہوا باہر نکل گیا — اماں نے آخری روٹی اتار کر آگ بجھائی۔ روٹیاں کپڑے کی صافی میں لپیٹ کر سینی سے ڈھانک دیں۔ ہاتھ دھو کر میاں سے پوچھا —

’’بشیر کے ابا کھانا لگاؤں؟‘‘ —

’’رہنے دو ابھی بھوک نہیں ہے۔ بشیر چلا گیا؟‘‘ —

’’ہاں چلا گیا۔ تم گھر کی فکر میں گھلتے رہو۔ جسے فکر کرنا چاہئے وہ بے غیرت بنا مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا نکالتی ہوں۔‘‘

’’لڑکیاں آجائیں۔ سب لوگ ساتھ ہی کھالیں گے۔ کہاں بار بار سینی سجاؤ گی‘‘

رفیق میاں نے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں — جمعرات کی وجہ سے دوکان بند تھی۔ دو ایک جگہ پیسوں کی وصولی کے لئے جانا تھا — لیکن دھوپ کی وجہ سے ہمت نہیں پڑ رہی تھی —

وہ پچھلے بیس سال سے حاجی صاحب کی دوکان پر ملازم تھے۔ ان کا اناج کی آڑھت کا کاروبار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حاجی صاحب کی کوٹھیاں کھڑی ہو گئیں۔ بازار میں

گیا— چاروں لڑکوں کو الگ الگ بزنس کرا دیا— دو بیٹیوں کی شادی کر دی— لاکھوں کا جہیز دیا۔ جتنا لڑکیوں کو دیا تھا۔ بہوئیں اس کا دس گنا میکے سے لے آئیں— ہر کام میں نفع ہی نفع تھا۔ رفیق میاں نے پچیس روپے ماہوار پر ان کے ہاں کام شروع کیا تھا۔ اب کہیں چار سو مل رہے تھے— اس پر بھی حاجی صاحب ہر ماہ انہیں تنخواہ دیتے وقت مہنگائی کا رونا ضرور روتے تھے— حالانکہ وہ ان سے دو آدمیوں کا کام لیتے تھے— دوکان پر حساب کتاب لکھنے کے علاوہ کہیں سے بقایا رقم وصول کرنا ہوتی تھی تو رفیق میاں کو ہی بھیجتے تھے— وہ بھی اتنے ایماندار تھے کہ کبھی ایک دھیلے کی ہیرا پھیری نہیں کرتے تھے۔ ہزاروں کی رقم حفاظت سے مالک کے حوالے کر کے خدا کا شکر ادا کرتے تھے— بازار کے بیوپاری سہ گنی تنخواہ دینے کے لئے تیار تھے— لیکن مالک سے غدّاری کرنا وہ بدترین گناہ سمجھتے تھے۔ غربت نے انہیں اور کچھ دیا ہو یا نہیں۔ ایمانداری، وفاداری اور شرافت کا سبق ضرور دیا تھا۔ بشیران کی باتوں سے بہت جلتا تھا۔ باپ بیٹے میں کئی بار تکرار بھی ہو چکی تھی— بشیر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اتنی کم تنخواہ پر حاجی صاحب کے پاس کام کیوں کرتے ہیں؟ کہیں اور کیوں نہیں ملازمت کر لیتے۔ گھر کی پریشانیاں ان سے چھپی تو نہیں تھیں— یہ ایمانداری اور انہیں اور گھر والوں کو کیا دے رہی ہے— بھوک، فاقے، پرانے لباس، ٹوٹے برتن اور دن رات کی ہائے ہائے؟— رفیق میاں کا ایک ہی جواب تھا—

''اتنے برس سے حاجی صاحب کا نمک کھا رہا ہوں۔ اس عمر میں چار پیسوں کی خاطر اپنی نیک نامی پر بٹہ نہیں لگاؤں گا''

''گھر والے بھوکوں مر رہے ہیں اس کی آپ کو کوئی فکر نہیں ہے؟''

بشیر بلبلا کر کہتا—

''گھر والے پالنے میں نہیں جھول رہے ہیں۔ خدا نے ہاتھ پاؤں دیئے ہیں کما کر کھا سکتے ہیں۔ نمک حرامی کر کے میں اپنی عاقبت کیوں خراب کروں؟''—

''عاقبت سے پہلے رقیہ اور سکینہ کی فکر کیجئے۔ آخر انہیں بیاہنا ہے یا نہیں؟''—

''ان کا بھی اللہ مالک ہے۔ جس پاک پروردگار نے بیٹیاں دی ہیں۔ وہی ان کی

ڈولی اٹھانے کا انتظام کرے گا"

رفیق میاں کی قناعت اور اطمینان پر بشیر کو غصہ آجاتا اور وہ حاجی کو باتیں سنانے لگتا—وہ تو ان سے اتنا خار کھاتا تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو ان کا ٹینٹوا ہی دبا دیتا— کم بخت ایک نمبر کا کنجوس تھا۔ کیا مجال جو کبھی عید، بقر عید پر باپ کا ایک جوڑا ہی بنا دیتا۔ یا بچوں کے نام سے دس بیس روپئے عیدی کے ہی دے دیتا۔ رفیق میاں نے کئی بار اس سے کہا کہ جا کر حاجی صاحب سے مل لے۔ کہیں نہ کہیں وہ اسے کام پر لگوا دیں گے۔ لیکن وہ تو ان کا نام سنتے ہی چڑھ دوڑتا تھا—

رقیہ اور سکینہ کو بھائی کی حرکتیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ اس عمر میں تو لڑکے پورے گھر کی ذمے داری اٹھاتے ہیں۔ دس کلاس بھی اس نے خدا جانے کیسے پاس کر لئے تھے۔ اس پر خواب اعلیٰ ملازمت کے دیکھا کرتا تھا۔ چھوٹی موٹی نوکری کرنا اس کی شان کے خلاف تھا— ماں باپ اسے ننگا بھوکا تو نہیں دیکھ سکتے تھے اوپر کے خرچ کے لئے پیسے بھی اماں سے اور کبھی بہنوں سے اینٹھ لیتا تھا— دونوں بہتیں سلائی کے کارخانے میں کام کرتی تھیں اور جو پیسے ملتے تھے وہ ماں کے ہاتھ پر دکھ دیتی تھیں۔ گھر کے حالات نے انہیں کچھ زیادہ ہی حساس بنا دیا تھا—

ایک دن دوسرے محلّے کے لڑکے نے راستے میں رقیہ کو چھیڑ دیا۔ سکینہ کی طبیعت خراب تھی اس لئے اسے تنہا جانا پڑا تھا———اس لڑکے کی بھی شاید تقدیر خراب تھی کہ اتفاق سے اس وقت بشیر ادھر جا نکلا— اور اس نے جم کر لڑکے کی پٹائی کر دی— پورا محلّہ اکٹھا ہو گیا۔ پولس آ گئی۔ دونوں پکڑ کر تھانے لے جائے گئے۔ ان کے بیان اور محلّے والوں کی گواہی کے بعد بشیر کو تو چھوڑ دیا گیا اس لڑکے کو حوالات میں بند کر دیا گیا— اس واقعہ کے بعد بشیر کی دھاک جم گئی۔ محلّے کے لڑکوں نے اس کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ اب سارے جھگڑے، قضیے یار دوست اس کے سامنے پیش کرتے۔ وہی فیصلہ کرتا۔ وہی نپٹارا کراتا۔ اس کی لیڈری کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ چھوٹے بڑے سب اس سے خوف کھانے لگے۔ اور رفیق میاں کی عزت بھی بڑھ گئی— بہنوں کو بھی اپنے گبرد بھائی پر بڑا مان تھا— پیسہ نہ سہی وہ ان کی

عزت کا رکھوالا تو تھا۔ رفیق میاں تو بیٹے کی داداگیری کی بدولت ملنے والی عزت سے بھی خوفزدہ تھے — البتہ اماں کا رویّہ یکسر بدل گیا تھا — آتے جاتے وہ اس کی چوڑی چھاتی اور بھرے بھرے مضبوط بازوؤں کی بلائیں لیتی تھیں اور نظرِ بد سے بچانے کی دعا پڑھ کر اس پر پھونک دیتی تھیں —

ایک جگہ سے رقیہ کا رشتہ آیا تو رفیق میاں نے چھان بین کے بعد اپنی منظوری دے دی۔ اس سے اچھا رشتہ ملنا مشکل تھا — لڑکا آفس میں کلرک تھا — شریف لوگ تھے — لڑکے والے رقیہ کو منگنی کی انگوٹھی پہنا نے آئے تو شادی کی تاریخ بھی لے گئے۔ گھر کی پہلی شادی تھی۔ خوشی کے ساتھ ساتھ ماں باپ کو یہ بھی فکر تھی کہ جہیز کا کیسے انتظام ہوگا۔ باراتیوں کی خاطر — مدارات کا کیا ہوگا — ؟ بشیر سے تو ایک پائی کی امید نہیں تھی۔ اس موقع پر اس کی لیڈری کام نہیں آسکتی تھی — جو بھی کرنا تھا انہیں خود ہی کرنا تھا —

رفیق میاں سارے دن کے تھکے ماندے گھر آئے اور کھانا کھا کر سونے کے لئے لیٹے تو بیوی نے پوچھا —— ''بشیر کے ابا — تم نے حاجی صاحب سے رقیہ کی شادی کا ذکر کیا تھا — ؟''۔

''کیا تھا'' — رفیق میاں نے دھیرے سے کہا۔

''پھر کیا بولے؟'' —

''کچھ نہیں۔ بس مبارکباد دے دی'' —

''تم نے ان سے پیسوں کی بات نہیں کی؟'' —

''نہیں۔ ہمت ہی نہیں ہوئی'' —

''ساری زندگی تم نے ان کی خدمت کی ہے۔ تو کیا اس موقع پر وہ چند ہزار بطور قرض بھی نہیں دے سکتے؟'' —

''سوچ رہا ہوں مکان رہن رکھ دوں'' —

''نہ چھڑا پائے تو سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی ہاتھ سے جائے گا''

''مجبوری ہے'' رفیق میاں نے ٹھنڈی سانس لی'' —

بشیر ذرا فاصلے پر سو رہا تھا۔ اس نے کروٹ لی تو دونوں چپ ہو گئے۔ جب سے رقیہ کی شادی طے ہوئی تھی۔ اس کا غصہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ بات بات پر حاجی کو باتیں سنانے لگتا تھا۔۔ صبح چائے پیتے ہوئے بشیر نے کہا۔۔

"اماں۔۔ ابا سے کہنا اپنا مکان رہن نہ رکھیں"۔

اماں کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔

"کمبخت مَست مارے پڑا تھا۔ ساری باتیں سن لیں۔ ہم سمجھے سو رہا ہے"۔ اماں نے ہولا کر سوچا۔ پھر بڑے پیار سے کہا۔۔ "ٹھیک ہے کہہ دیں گے۔ تو فکر نہ کر۔ کچھ اور انتظام کرلیں گے"۔۔

"اب تو جو بھی کرنا ہے مجھے کرنا ہے۔ تم دونوں چپ ہو کر بیٹھو"۔۔

بشیر نے بڑی رعونت سے کہا۔ اماں بھڑک گئیں۔ اس کی پیٹھ پر دو ہتڑ مار کر بولیں۔۔

"تو کیا کرے گا؟ کہیں ڈاکہ ڈالے گا کیا؟۔ بڑا آیا کہیں سے دادا بن کر۔ خبردار جو کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا"۔۔

"اماں۔۔ میری اماں۔۔ تم سے اچھا تو پوری دنیا میں کوئی نہیں ہے" وہ ہنستا ہوا کمرہ میں آ گیا۔۔ الماری سے رامپوری چاقو نکال کر احتیاط سے جیب میں رکھا۔ اور اماں کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ سامنے سے ابا حاجی صاحب کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ حاجی کو دیکھ کر اس کا موڈ خراب ہو گیا "یہ منحوس یہاں کیوں آیا ہے؟"۔۔

وہ منہ ہی منہ بڑبڑایا وہ لوگ قریب آ گئے تو اس نے بادل نخواستہ حاجی صاحب کو سلام کیا۔ ابا نے کہا۔۔ "بیٹھک کھول دے بیٹا۔۔ اور ماں سے کہنا چائے بنا دیں۔۔ بشیر نے کمرہ کھولا۔ اماں سے چائے کے لئے کہہ کر فوراً واپس آ گیا۔ اس کے دل میں دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی۔۔ جیب میں رکھا ہوا چاقو بالکل نیا تھا۔ ابھی تک اس نے خون کا مزہ نہیں چکھا تھا۔۔ لیکن اس کے دل میں خواہش ضرور تھی کہ ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار اسے خون کا مزہ چکھا دے۔ وہ تو گھر سے نکلا بھی اسی ارادے سے تھا۔ لیکن۔۔۔

حاجی صاحب نے اپنے کرتے کی جہازی جیب سے خاکی زین کی ایک تھیلی

نکالی۔ اور رفیق میاں کے سامنے رکھ دی۔ ''رفیق میاں! یہ رہی آپ کی امانت'' —
حاجی صاحب نے مسکرا کر کہا—
''کیسی امانت—؟ حاجی صاحب میں سمجھا نہیں'' —
''آپ کی تنخواہ دینے کے بعد جو رقم بچتی تھی— وہ میں بینک میں جمع کرتا رہا۔ اصل اور سود ملا کر اکتالیس ہزار ہو گئے۔ دس ہزار میں نے اس میں اپنی طرف سے ملا دئے۔ میرے خیال میں اکیاون ہزار روپے رقیہ بیٹی کی شادی کے لئے کافی ہوں گے۔؟''
''— لیکن تنخواہ تو آپ ہر مہینے دیتے تھے''
''— لیکن — پوری نہیں۔ صحیح تنخواہ تو میں نے مصلحتاً آپ کو نہیں بتائی تھی— پیسے گھر میں آتے ہیں تو خرچ ہو جاتے ہیں— اس لئے میں چار سو دے کر باقی پیسے آپ کے حساب میں جمع کرتا رہا— میں بھی کبھی ایسے ہی حالات سے گزر چکا ہوں۔ آپ کی پریشانیوں کا اندازہ کر سکتا ہوں یہ آپ ہی کے پیسے ہیں۔ اور ہاں بشیر میاں تمہارا کیا ارادہ ہے؟''
''جیسا آپ حکم کریں؟''— وہ منمنایا—
''بہن کی شادی سے فارغ ہو کر میرے پاس آنا کسی نہ کسی کام میں لگا دوں گا'' —
''جی— جی— میں حاضر ہو جاؤں گا— ''
بشیر کی سعادت مندی پر رفیق میاں کو بڑی حیرت ہوئی۔
اماں نے اسے بازار مٹھائی لانے کے لئے بھیج دیا— مہمان کی خاطر مدارات خالی حولی چائے سے کیا کرتیں؟—

بازار جاتے ہوئے بشیر نے چاقو نالے میں پھینک دیا— وہ حاجی صاحب کے پاس کام کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا— پرانے چراغوں کے سامنے نئے چراغ کی روشنی ماند پڑ گئی تھی۔ اب نہ اسے ابا کی ایمانداری اور وفاداری سے اختلاف تھا۔ اور نہ ہی حاجی صاحب سے کوئی شکایت تھی— بلکہ وہ تو ان کے اخلاق اور مروّت کا دل سے قائل بھی ہو گیا تھا— اور اپنے چاقو سے زیادہ اسے دونوں بزرگوں پر اعتبار ہو گیا تھا— جن کے کردار کی فولادی دیوار سے ٹکرا کر اس کے چاقو کی دھار کند ہو گئی تھی—

☆☆

بڑے بھیّا

اس کے لئے خالہ امی کا گھر اور اس کے مکین اجنبی نہیں تھے۔ وہ پہلے بھی یہاں آتی رہی تھی۔ لیکن کافی عرصہ سے یہ سلسلہ تقریباً بند ہو گیا تھا— اس بار وہ انٹرمیڈیٹ کا امتحان دینے آئی تھی۔ قصبہ میں لڑکیوں کا ایک ٹوٹا مارا سرکاری ہائی اسکول تھا— اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے ابو نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے ذریعہ اس کا فارم بھروادیا تھا۔ تاکہ وہ پرائیویٹ انٹر کا امتحان دے سکے— حالانکہ وہ چاہتے تو کالج میں داخلہ بھی دلا سکتے تھے— لیکن اکلوتی بیٹی کو خود سے جدا کرنا انہیں گوارا نہیں تھا— سب سے زیادہ شکایت تو انہیں ہاسٹل کے پھیکے سیٹھے کھانوں سے تھی۔ اپنے زمانہ طالب علمی میں انہیں اس کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا— ہائی اسکول کرنے کے بعد لڑکیاں یا تو گھر بیٹھ کر کڑھائی سلائی کرتی تھیں۔ یا پھر شادی کر کے سسرال آباد کرتی تھیں۔ لڑکے البتہ شہر جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ ورنہ زیادہ تر قصبہ میں رہ کر کھیتی باڑی کرتے تھے— یا ضروری کام کا بہانہ بنا کر شہروں میں جا کر تفریح کرتے تھے—

اسے خالہ امی کا گھر بڑے بھیّا کے حوالہ سے یاد تھا— جو بچپن میں اس کی انگلی تھام کر بازار لے جاتے تھے اور ڈھیر ساری ٹافیاں اور چاکلیٹ دلواتے تھے۔ اور مزے مزے کی آئس کریم کھلاتے تھے— بڑے بھیّا سے چھوٹا ثمر تھا— جس سے اس کی ایک منٹ نہیں بنتی تھی— پھر ثمینہ تھی— اس کے مقابلہ میں اپنے شہری ہونے کا احساس اسے کچھ زیادہ ہی تھا۔ حالانکہ وہ اسے بھی ٹھینگے پر مارتی تھی۔ لیکن مجبوراً اس سے بنا کر رکھنا پڑتی تھی—

خالہ امی نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسے لپٹا کر چٹ چٹ بلائیں بھی لیں۔ اور اس کی امی سے کہنے لگیں—

''عذرا—— یہ زینو ماشاءاللہ کیسی پیاری ہوگئی ہے۔ اور بڑی بھی۔ میری آنکھوں میں خاک۔ کیسا اچھا قد نکالا ہے''—

اس نے شرمانے کے بجائے مسکرا کر گویا ان کی تعریف قبول کی۔ اور تیز طرّار ثمینہ اس کی تعریف پر بھنا کر باورچی خانہ میں گھس گئی۔ ''اس کی بلا سے وہ چولہے میں گھس جائے'' اس نے دل میں کہا— اور چکر مکر گھر کا جائزہ لینے لگی۔ لیکن بڑے بھیا اور ثمر نظر نہیں آئے۔ دونوں بہنیں ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں—

اچانک دروازہ کھلا اور رنگین قمیض اور ٹائیٹ جینز میں ملبوس ایک ہونق سا لڑکا شور مچاتا اندر داخل ہوا۔ ''ارے خالہ جان آئی ہیں۔ سلام وعلیکم— اور یہ کیا زینو ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں سمجھا آپ اس بار گاؤں سے اپنے رشتے کی نند وغیرہ کو لے کر آئی ہیں۔ یہ تو تاڑ کی طرح لمبی اور—— خیر جانے دیں۔ یہ خفا ہو جائے گا۔''

یہ ثمر تھا۔ وہ سلام کرنے کا ارادہ ترک کر کے اسے گھورنے لگی۔ اپنی ناگواری چھپانے کی اس نے کوشش نہیں کی۔ ثمر ہنسنے لگا— وہ بھی بچپن کی کٹ کھنّی زینو کو اب تک نہیں بھولا تھا اور اپنی دانست میں پہلا ہلّا بول دیا تھا—

''ہاں بھئی سنا ہے کہ تم انٹر کا امتحان دے رہی ہو—؟'' وہ براہِ راست اس سے مخاطب ہوا۔ اس نے تڑخ کر کہا—

''کیا آپ کو شک ہے؟''—

''نہیں بھئی— شک تو نہیں ہے۔ اکثر گاؤں اور قصبوں سے لڑکیاں ہمارے شہر امتحان دینے آتی ہیں۔ اور نہایت شاندار طریقے سے فیل ہو جاتی ہیں''—

کہہ کر وہ ہنسا—

''میں نے تو سنا ہے کہ یہاں کے ریگولر طالب علم اکثر ایک ہی کلاس میں کئی کئی سال لگا دیتے ہیں آخر ممتحن پریشان ہو کر خود ہی انہیں تین ڈنڈے تھما دیتے ہیں تا کہ اگلے

برس ان کی صورت نہ دیکھنا پڑے۔۔۔''

اس نے فوراً حساب بیباق کیا۔۔۔ زینو کی بھبتی ثمر کے چپک گئی۔ حالانکہ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ موصوف نے 'بی کام' میں چار سال لگا کر تھرڈ ڈویزن حاصل کیا تھا۔۔۔ اور تب ثمر نے راہِ فرار اختیار کی۔ اور نہانے کا بہانہ کر کے غسل خانہ میں گھس گیا۔۔۔ اس نے دل میں 'وہ مارا' کا نعرہ مارا۔۔۔ اور ثمینہ کی مدد کرنے کے خیال سے باورچی خانہ کا رُخ کیا۔۔۔

شام سے پہلے بڑے بھیا بھی آ گئے۔ اس کی امی کو سلام کر کے خیریت پوچھی۔۔۔ پھر اس کی طرف مخاطب ہوئے۔ اس نے جھٹ سے انہیں آداب کیا۔۔۔

''ماشاءاللہ زینب بہت سمجھدار ہو گئی ہے۔ خالہ امی یقین نہیں آتا یہ وہی کھلنڈری اور شوخ لڑکی ہے پھر اس سے کہا۔'' کیا تم سچ مچ انٹر کا امتحان دینے والی ہو؟''۔

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔۔۔ تو وہ بھی ہنس دیئے۔

''میں تمہارا اسینٹر اور سیٹ بھی دیکھ آیا ہوں۔ کل میرے ساتھ چلنا اور خود بھی دیکھ لینا۔۔۔ میرا جاننے والا کلرک ہر طرح تمہاری مدد کرے گا''۔۔۔

''شکریہ بڑے بھیا۔۔۔ مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی''

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کسی مضمون میں مشکل محسوس ہو تو بتا دینا۔۔۔ ویسے لڑکیاں پڑھائی کے معاملہ میں بہت سنجیدہ ہوتی ہیں۔۔۔ تم بھی ہوگی۔ مجھے یقین ہے۔'' اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ بڑے بھیا کے یقین کا بھرم رکھے گی۔۔۔ وہ خالہ جان سے معذرت کر کے اوپر چلے گئے۔

بڑے بھیا کسی کالج میں سائنس کے لکچرر تھے۔۔۔ شام کے وقت وہ کوچنگ سینٹر چلے جاتے تھے جہاں وہ اسٹوڈنٹس کو 'پی ایم ٹی' کی تیاری کراتے تھے۔۔۔ اپنے ابا کے انتقال کے بعد انھوں نے گھر کی ساری ذمہ داری سنبھال لی تھی۔۔۔ اور اپنی امی یا بھائی بہن کو یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ اس گھر کا سرپرست اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ نہ ہی اخراجات میں کوئی کمی کی تھی۔۔۔ جس طرح ابا گھر کے خرچ کے لئے پیسہ امی کے ہاتھ میں دیتے تھے۔ اسی طرح وہ بھی امی کو کل آمدنی سونپ دیتے تھے۔ امی سیاہ کریں یا سفید وہ کبھی الٹ کر نہیں

پوچھتے تھے۔۔۔ ثمر اور ثمینہ کے تعلیمی اخراجات اور دوسری ضروریات کا بھی وہ پورا خیال رکھتے تھے۔۔۔ ہر سال ان کا جیب خرچ بھی خندہ پیشانی سے بڑھا دیتے تھے۔۔۔ اوپر سے ان کی فرمائیش کم نہیں تھیں۔ لیکن بڑے بھیا کے ابرو پر شکن نہیں آتی تھی۔ اس کے باوجود ان کے رویئے سے کبھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس گھر کے واحد کمانے والے فرد ہیں۔۔۔ جتانا تو دور رہا۔۔۔ ثمر کچھ زیادہ ہی شوقین مزاج تھا۔ اس کے پاس کپڑوں اور جوتوں کا اتنا اسٹاک تھا کہ اچھی خاصی ایک دوکان کھول سکتا تھا جبکہ بڑے بھیا کے پاس گنتی کے کپڑے تھے۔ جنہیں وہ بہت سنبھال کر استعمال کرتے تھے۔۔۔ بلکہ اپنی ذات پر پیسہ خرچ کرنے کے بارے میں وہ شاید سوچتے ہی نہیں تھے۔ چند دن رہ کر یہ ساری باتیں زینو نے اچھی طرح نوٹ کی تھیں۔۔۔ اور اسے بڑے بھیا پر بہت ترس آیا تھا۔۔۔ سب سے زیادہ دکھ تو اسے یہ دیکھ کر ہوا تھا کہ خالہ امی، ثمر یا ثمینہ ان کا کوئی خاص خیال نہیں کرتے تھے۔ اپنا سارا کام وہ خود ہی کرتے تھے۔ اس نے یہ کبھی نہیں دیکھا تھا کہ ثمینہ نے ان کے کپڑے دھوئے ہوں یا استری کرنے کی زحمت کی ہو۔ جبکہ ثمر اپنا ہر کام اس کے سر پر سوار ہو کر کرالیتا تھا اور خالہ امی بھی ثمر ہی کی حمایت کرتی تھیں۔ مجبوراً ثمینہ کو بھی اس کے نخرے اٹھانا پڑتے تھے۔۔۔

اتوار کا دن تھا۔ ثمر گھر سے غائب تھا اس لئے بڑا سکون تھا۔ وہ رہتا تو سارا گھر سر پر اٹھائے رکھتا تھا۔ ثمینہ بوا کے ساتھ کچن میں مصروف تھی اس کی امی بھی بہن سے باتوں میں مگن تھیں۔ وہ خاموشی سے اوپر چلی گئی۔ بڑے بھیا اسے دیکھ کر مسکرائے۔ پوچھا ''اپنی پرابلم''۔ اور کپڑے باتھ روم میں ڈال کر باہر آ گئے۔۔۔

''بڑے بھیا آپ کل کے لکچر کی تیاری کریں۔ کپڑے میں دھوئے دیتی ہوں۔'' وہ غسل خانہ میں جھپاک سے گھس گئی۔

کیوں میری عادتیں خراب کر رہی ہو۔؟ میں تو بڑے آرام سے سارے کام کر لیتا ہوں''۔۔۔

''دو چار دن میں آپ کی عادتیں بگڑنے والی نہیں ہیں''۔

''تم اپنا وقت کیوں خراب کر رہی ہو۔ کیا پڑھنا نہیں ہے؟''

''آپ مجھے کوڑھ مغز کیوں سمجھ رہے ہیں۔ میری تیاری مکمل ہے۔ بس تھوڑا بہت دیکھ لیتی ہوں''۔

''پیپرز کیسے ہو رہے ہیں؟''۔

''بہت اچھے۔۔۔ اگر آپ کی دعائیں ساتھ رہیں تو فرسٹ ڈویژن لاؤں گی''۔۔۔ بڑے اعتماد سے کہہ کر مسکرائی۔

''انشاءاللہ۔۔۔ بلکہ اب تو دعاؤں میں اضافہ کرنا پڑے گا۔''

وہ ہنسنے لگی۔ اور بڑے بھیا اسے اس کے حال پر چھوڑ کر نیچے چلے گئے۔ شاید کوئی کام یاد آ گیا تھا۔ کپڑے دھو کر اس نے الگنی پر پھیلائے۔ کمرہ میں جھانکا تو صفائی ستھرائی دیکھ کر مزید دکھ ہوا۔۔۔ یقیناً یہ سب بڑے بھیا خود ہی کرتے تھے اس نے کبھی ثمینہ یا ملازم لڑکے کو ان کا کوئی کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ کم از کم بوا یا ملازم لڑکے کو تاکید کر کے بڑے بھیا کے کام کرانا کچھ مشکل نہیں تھا۔۔۔ لیکن ساری بات توجہ اور خیال کی تھی۔ یہ سارے ٹھاٹ باٹ جس کے دم سے تھے وہ چائے کے ساتھ سوکھے رَسک کھا کر چلا جاتا تھا اور گھر والے اس کی کمائی سے انڈے پراٹھے اڑاتے تھے۔۔۔

وہ اداس اور دل گرفتہ سی نیچے چلی آئی۔ بڑے بھیا گھر میں نہیں تھے۔۔۔ وہ کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ پڑھنے میں جی نہ لگا تو لیٹ کر سو گئی۔

زینو آخری پرچہ دے کر واپس آئی تو دل و دماغ سے منوں بوجھ اتر گیا تھا۔۔۔ اس نے امی سے اگلے دن واپسی کا پروگرام بنا ڈالا۔۔۔ لیکن خالہ امی نہیں مانیں۔ کہنے لگیں۔۔۔

''بچی۔۔۔ جب سے آئی ہو کتابوں میں سر دیئے بیٹھی ہو۔ اب ذرا گھومو پھرو۔۔۔ شاپنگ کرو۔ ایک دو فلمیں دیکھو۔ یہ کیا کہ بستر باندھنے لگیں''۔

ثمینہ نے بھی ماں کی تائید کی۔ اس نے کہا۔۔۔

''خالہ امی۔۔۔ میں تو گھر جا کر کئی دن لمبی تان کر سوؤں گی''۔۔۔

''وہ پروگرام بعد کا ہے۔ فی الحال تو ہم تفریح کریں گے۔ میں بھی ہفتوں سے گھر میں قید ہوں''۔۔۔ ثمینہ نے دہائی دی۔۔۔

''تم کو گھر بیٹھنے کے بجائے بی۔اے میں داخلہ لینا چاہیے تھا''—

میں نے تو بہت چاہا۔لیکن امی مجھے گھر سے نکالنے کی تیاری کر چکی ہیں۔'' ثمینہ نے رازداری سے کہا— وہ ہنسنے لگی—

''یہ کھی کھی کیوں لگا رکھی ہے؟'' ثمر نے جل کر پوچھا—

''آپ کے مطلب کی بات نہیں ہے—'' ثمینہ نے منہ بنایا—

''نہ سہی اچھی سی چائے بنا کر پلاؤ'' فوراً حکم صادر کیا—

''بھائی سارا دن چائے اور کافی پیتے ہو— تمہارا رنگ بھی اسی سے ملتا جا رہا ہے۔اب اگر کوئی پوچھے گا کہ تمہارا بھائی گورا ہے یا کالا— تو کہنا پڑے گا'' کافی کلر ہے''—

ثمینہ نے دوڑ کر صحن پار کیا اور کچن میں گھس گئی— چائے تو بہر حال بنانا ہی تھی— اب کمرہ میں وہ اور ثمر آمنے سامنے بیٹھے تھے— جیسے دو حریف— زینو نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا—

''زینو کیا تم سچ مچ جا رہی ہو؟''— خلافِ معمول ثمر سنجیدہ تھا— اس نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیا جھوٹ موٹ بھی کوئی جاتا ہے؟''— اس نے ہنس کر کہا۔

''مذاق نہیں— میں سیریس ہوں۔ ابھی تو تم سے اطمینان سے بات بھی نہیں ہوئی۔سوچا تھا کہ تمہارا امتحان ختم ہو جائے تو ذرا——''۔

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے کوئی معرکہ سر کرنا ہے''—

''ہے تو معرکہ ہی— اب یہ نہیں معلوم کہ سر ہوگا بھی یا نہیں۔ دراصل تم میرے متعلق کچھ اچھی رائے نہیں رکھتی ہو؟''—

''یہ آپ کو کیسے پتہ چلا؟''—

''اندازہ—— بلکہ تجربہ''—

''ماشاءاللہ آپ کو تو داد دینا چاہیے—''—

''یعنی میرا اندازہ صحیح ہے؟''—

''سارے سوال جواب آپ خود کر رہے ہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔''

لاپرواہی سے کہہ کر زینو باہر چلی گئی — اور ثمر کی کھوپڑی بھک سے اُڑ گئی۔

خالہ امی کے اسرار پر اسے دو دن مزید رکنا پڑا۔ اور تفریح میں حصہ بھی لینا پڑا۔ چلتے وقت بڑے بھیا نے اسے کئی تحائف دیئے جو اس نے اپنا حق سمجھ کر قبول کئے۔ ثمر البتہ اس سے کٹا کٹا رہا — جس کی اس نے ذرا بھی پرواہ نہیں کی۔

اگلی بار وہ ثمینہ کی شادی میں شرکت کرنے کے لئے ابو اور امی کے ساتھ خالہ امی کے گھر گئی اور بہت سے کام اپنے ذمے لے لئے — خالہ امی اس کی سلیقہ مندی سے بہت خوش ہوئیں۔ انہیں تو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی سگھڑ ہوگی — بڑے بھیا نے اس سے کئی باتوں میں صلاح لی تو خوش ہو گئے۔ اور اس کے مشوروں کی قدر بھی کی۔ وہ دوڑ دوڑ کر سارے کام کر رہے تھے — لیکن خالہ امی ان کے ہر کام میں عیب تلاش کر لیتی تھیں۔ یہ سب اسے بڑا عجیب سا لگتا تھا — اور پھر وہ اڑ گئیں کہ ثمینہ کو جہیز میں چار نہیں پانچ سیٹ دیئے جائیں گے۔ بڑے بھیا بے چارے چپ ہو گئے — شاید وہ بیس پچیس ہزار فالتو خرچ کرنے کے متحمل نہیں تھے — دوسری طرف ماں کی ناراضگی کا بھی خیال تھا۔ اس نے سوچا کہ ثمینہ کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرے۔ شاید اس کے کہنے سے خالہ امی مان جائیں — لیکن ثمینہ تو ماں کی بولی بول رہی تھی — اسے بھی بڑے بھیا سے شکوہ تھا — اس نے سمجھایا۔

''ثمینہ! ابھی تو موٹے موٹے کئی خرچ سامنے ہیں۔ تمہارے ہونے والے دولہا کی فرمائش ہے کہ براتیوں کا استقبال شاندار ہونا چاہئے۔ روشنی اور سجاوٹ اس کے علاوہ ہوگی'' —

''اس میں کون سی نئی بات ہے زینو — سب لوگ چاہتے ہیں کہ چار لوگوں میں عزت بڑھے۔ یہ تو اُن کی شرافت ہے کہ کوئی ڈیمانڈ نہیں کی — ورنہ لوگ فلیٹ اور کار تک مانگ لیتے ہیں''

ثمینہ نے سسرال والوں کی طرفداری کی۔۔

'جو جتنا زیادہ بے غیرت اور لالچی ہوتا ہے وہ اسی حساب سے مانگتا ہے۔

دوسرے کی حیثیت نہیں دیکھتا — بڑے بھیا بغیر مانگے دولہا کو موٹر سائیکل دے رہے ہیں تو میرے خیال میں وہ زیادہ شریف ہیں'' زینو نے جل کر کہا —

''میں تو اتنا جانتی ہوں کہ اگر میرا سگا بھائی ہوتا تو وہ ہر قیمت پر ہماری خوشی اور خواہش کا خیال رکھتا'' —

''تو کیا بڑے بھیا — ؟'' اس سے جملہ پورا نہ ہو سکا —

''تعجب ہے کہ تم نہیں جانتیں کہ بڑے بھیا ہمارے سوتیلے بھائی ہیں امی جب بیاہ کر آئیں تو وہ چار سال کے تھے'' ثمینہ نے تلخی سے کہا — زینو کا دل چاہا کہ چیخ چیخ کر رونے لگے' ہائے بڑے بھیا۔ آپ کیسے بدنصیب ہیں کہ سگے بیٹے اور بھائی سے بڑھ کر آپ نے ماں اور بھائی بہن کا خیال رکھا لیکن پھر بھی آپ کو سوتیلے کا خطاب ملا — کاش آپ نے شروع سے سوتیلے پن کا سلوک کیا ہوتا تو آج کسی کو آپ سے شکوہ نہ ہوتا — ''

زینو کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ آہستہ قدموں سے جہیز والے کمرہ میں گئی۔ پورا کمرہ قیمتی سامان سے اثاث بھرا ہوا تھا۔ پھر بھی کوئی خوش نہیں تھا — اس کے بعد شادی کی رسموں میں اس کا دل نہیں لگا — بارات والے دن بڑے بھیا نے ایک بڑا سا مخملی ڈبہ خالہ امی کے سامنے رکھ دیا۔

''امی یہ ثمینہ کے لئے ہے۔ یہ سیٹ بھی جہیز میں شامل کر دیں۔'' خالہ امی نے ڈبہ کھول کر دیکھا۔ بے دلی سے بند کر کے کہا ''ٹھیک ہے'' اور مڑ کر امی سے باتوں میں مصروف ہو گئیں — بڑے بھیا شرمسار سے باہر چلے گئے۔

ثمینہ بیاہ کر سسرال چلی گئی۔ زینو کا دل ایک دم اچاٹ ہو گیا۔ وہ خاموشی سے زینہ طے کر کے اوپر چلی گئی۔ بڑے بھیا کے کمرہ میں جھانکا۔ کمرہ خالی تھا — اس نے بکھری ہوئی چیزیں سمیٹیں — بیڈ کور بدلا — پھر ان کی پڑھنے کی میز کے سامنے بیٹھ کر کتابیں اُلٹ پلٹ کرنے لگی — دل تھا کہ بھر بھر آ رہا تھا — یہ ثمینہ کی جدائی کا اثر تو نہیں تھا۔ پھر کیا تھا — ؟ اس کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا —

بڑے بھیا جھجکتے ہوئے اندر آئے چاروں طرف دیکھا کہنے لگے —

''تم نے اتنی محنت کیوں کی۔ذرا فرصت ملتی تو میں خود صفائی کر ڈالتا— تم پہلے ہی ڈھیروں کام کر کے تھک گئی ہو—''

وہ بیڈ کے کنارے ٹک گئے۔کچھ سوچ کر بولے—

''خالہ جان کل یا پرسوں جانے کے لئے کہہ رہی ہیں۔''

''جی—وہ ابو کو تکلیف ہوگی اس لئے''—

''میں تو خالو صاحب کو بھی روک رہا تھا— لیکن وہ بھی نہیں رُکے—اب تم لوگ تو کچھ دن ٹھہر جاؤ۔ثمینہ کے جانے سے گھر میں بہت سناٹا ہو گیا ہے—'' کہہ کر گہری نظروں سے اسے دیکھا''جی ہاں''سر جھکا کر بے خیالی میں کہا—اور کھڑی ہوگئی۔

''آپ آرام کریں۔میں چائے بھجواتی ہوں۔''پھر وہ ان کا جواب سنے بغیر چلی گئی—

گاؤں جانے سے پہلے امی نے اس سے کہا—

''زینو بیٹا—باجی ثمر کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔کہہ رہی تھیں ثمینہ کے جانے کے بعد وہ بالکل تنہا ہو گئی ہیں— ثمر کی دلہن آئے گی تو گھر کی رونق لوٹ آئے گی''—

''ثمر سے پہلے تو انہیں بڑے بھیا کی شادی کرنا چاہیے''—

''یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔اس میں باجی کیا کر سکتی ہیں؟''—

''اور ثمر کا معاملہ کس کا ہے—ان کا اپنا— کیونکہ وہ ان کی اپنی اولاد ہے—اور بڑے بھیا سوتیلے ہیں''—؟—

وہ پھٹ پڑی—

''باجی نے تو ایسا کبھی نہیں سوچا''امی نے صفائی دی—

''نہ صرف سوچا۔بلکہ عمل بھی کیا— یہ بات آپ بھی جانتی ہیں — اور میں بھی—''—

''ارے لڑکی چپ رہ۔باجی نے سن لیا تو کیا کہیں گی۔وہ تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔انھوں نے تمہارے ابّو سے بھی بات کی تھی—وہ بھی رضامند ہیں''—

''کیا—؟— یہ بات آپ لوگ خواب میں بھی نہ سوچئے گا— میں ان خود غرض لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں جوڑنا چاہتی سن لیا آپ نے — میں ثمر سے شادی نہیں کروں گی''—

وہ زن زن سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئی۔ ناہموار سانسوں کو چند منٹ ٹھہر کر سنبھالا— دروازہ کو ناک کیا پوچھا—

''میں آسکتی ہوں؟''—

''ارے زینو تم— آؤ بھئی'' انہوں نے کتاب الگ رکھی اور بیڈ کے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے— وہ ان کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی— آہستہ سے کہا—

''بڑے بھیا! میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں''—

''میں سن رہا ہوں۔ کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟''—

''کیا آپ کو علم ہے کہ گھر میں ثمر کی شادی کا ذکر ہو رہا ہے''؟

اوہ کیا سچ مچ— یہ تو بڑی اچھی خبر ہے— ثمر ماشاءاللہ ملازم بھی ہو گیا ہے''—

''خالہ امی نے ثمر کے لئے میرا رشتہ مانگا ہے۔ یہ بات امی نے ابھی مجھے بتائی ہے۔ اب یہ نہ کہئے گا کہ یہ تو اور زیادہ خوشی کی بات ہے—''

زینو نے جل کر تلخی سے کہا— اور وہ جو شاید یہی جملہ کہنے والے تھے ٹپٹا کر چپ ہو گئے—

''آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کیا چاہتی ہوں؟''—

''ہاں بھئی— بتاؤ— تم کیا چاہتی ہو؟'' انہوں نے پوچھا—

''میں ثمر سے شادی نہیں کروں گی'' اس نے دوٹوک اپنا فیصلہ دیا۔

''کیوں؟—''

''یہ بھی میں ہی بتاؤں؟— آپ نے فائل پر میرا نام کیوں لکھا ہے کیا یہ بھی میں ہی بتاؤں گی؟— اور پوچھئے۔ کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟''— وہ چیخ اٹھی دل چاہا خوب روئے—

''اگر امی نے ثمر کے لئے کہا ہے تو—''—

''تو کیا میں آپ کی طرح ان سے دبتی ہوں— نا ہی مجھے یہ خوف ہے کہ وہ مجھے سوتیلا ہونے کا طعنہ دیں گی۔ بڑے بھیا اگر آپ نے انکار کیا تو میں— تو میں—''—

''یہ کیا بڑے بھیا'' بڑے بھیا لگا رکھا ہے؟''—وہ جھینپ کر مسکرائی—

بڑے بھیا بے ساختہ ہنس دیے۔اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپالیا—

''ہائے کتنی مشکل سے اپنی بات انہیں سمجھائی تھی۔اور انھوں نے سمجھ لی تھی۔کاش وہ ہمیشہ ایسی ہی سمجھداری کا ثبوت دیں''—

زینو نے اطمینان کی سانس لی۔اور چوری چوری انہیں دیکھنے لگی—



دُعا

ہر برس نیا سال بڑے کرّ و فر سے آتا ہے اور بہت جلد پُرانا ہو کر گزرے ہوئے سالوں کی بھیڑ میں گم ہو جاتا ہے — ہر سال نئی اُمید بندھتی ہے — نیا جوش اور نیا ولولہ جاگتا ہے پھر سارے جذبے ساری خواہش — اور سارے ارمان آنکھیں موند کر سو جاتے ہیں۔ اور گزرے ہوئے وقت کی تلخ اور شیریں یادیں ہمارے 'آج' پر حاوی ہو جاتی ہیں — شاید زندگی اسی کا نام ہے —

اس بار نیا سال آیا تو بس کمال ہو گیا۔ قبل اس کے کہ لوگ خوشیوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں۔ پرانے برسوں کے انبار میں دفن کرتے — اچانک شہر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ یہاں، وہاں ہر گلی ہر کوچے میں اندھے قسم کے جوش اور ولولے کی تازہ لہر، برقی رو کی مانند دوڑ گئی۔ کیا بوڑھے کیا جوان سب اس لہر کے سنگ چل پڑے۔ چلتے رہے۔ اور چلتے چلتے ایک نئی تاریخ بھی رقم کرتے رہے۔ ایسی تاریخ جس کا ہر حرف سیاہ تھا۔ اور آگ کی تاریخی لپٹوں نے گل رنگ کتاب زندگی کا ہر ورق جلا کر خاکستر کر دیا تھا — ان دنوں اخبار کی سُرخیاں کچھ زیادہ ہی سرخ ہو گئی تھیں۔ قتل اور غارت گری کی منظر کشی، تباہی اور بربادی کے قصّے انسانوں کو نئے موسموں کی بشارت دے رہے تھے — لیکن جنّت و جہنّم — گناہ و ثواب کی فکر کس کو تھی — زندگی نے ایک نئی حرارت کا مزہ چکھا تھا۔ ہر دل میں نفرت کا زہر تھا — ہر سانس میں غصّے کے ناگ پھنکار رہے تھے — رگوں میں خون کی جگہ تعصب کا بے رحم جذبہ گرم سیال بن کر رواں دواں تھا — جب نفرت کا آتش فشاں آگ اُگلتا ہے تو گرم

لاوے کی زد میں آکر انسانیت، محبت، اخوت، رواداری اور وضع داری سب کچھ تہس نہس ہو جاتا ہے— تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے گواہ ہیں—

میں کئی دن سے گھر کے زنداں میں قید تھا— زنداں بھی کیسا جس کا ہر رَوزن، ہر دریچہ اور در نفرت کی میخیں ٹھونک کر مضبوطی سے بند کر دیا گیا تھا— شاید اس لئے کہ باہر سے کوئی طوفان اندر نہ آسکے— لیکن جو طوفان اندر تھا اس کو روکنے کی کوشش کسی نے نہ کی۔ میں اندر کے طوفان سے نبرد آزما تھا— اور اس کو روکنے کی کوشش میں ہلکان ہوا جا رہا تھا— زنداں کے پہرے داروں کی نظر بچا کر ایک دن میں باہر آگیا۔ سوچا کہاں جاؤں؟ اتنے عرصے سے بے سمتی نے حوصلے پست کر رکھے تھے۔ لیکن قدموں تلے سے زمین خود بخود سرکتی رہی اور میں نے خود کو پر پیچ راہوں کے جال میں پایا۔ اجنبی گلیاں، اجنبی راستے، اور منزل کا نشاں کھونے کا غم— اچانک ایک مانوس دروازہ نظر آگیا— اور میں ٹھٹھک گیا۔ خوشی سے بے حال ہو کر میں نے دروازہ کی کنڈی بجائی۔ اور کنڈی بجنے کی آواز نے گویا صورِ اسرافیل پھونک دیا۔ اندر سے آنے والی مدھم مدھم آوازیں تھم گئیں۔ آوازیں کیا تھمیں گویا ایک پل میں زندگی مر سی گئی لمحے صدیاں بن کر گزرنے لگے— آج سے پہلے انتظار کی گھڑیاں کبھی اتنی سخت محسوس نہیں ہوئی تھیں۔ آخر صدیوں کا سفر طئے کر کے ایک سہمی ہوئی آواز کیواڑوں سے باہر آئی۔ اس آواز نے مجھے از سرِ نو زندہ کر دیا—

''کون— ؟؟— جیسے کانوں میں جلترنگ سا بج اُٹھا۔ اپنے یار مرزا کی آواز سن کر میرے دل نے بچّے کی طرح قلقاری ماری اور مجھے اپنے وجود کا یقین سا آگیا—

''مرزا— 'میں' ہوں''

میں نے بڑے اعتماد سے کہا— میرے سینے میں دیر سے رکی ہوئی سانس آہستہ آہستہ باہر آنے لگی— اور میری ذات کا حبس دھیرے دھیرے ختم ہونے لگا۔ وہ اعتماد جو گھر کے زنداں سے نکلنے کے بعد سے اب تک کھویا ہوا تھا واپس مل گیا تھا—

'میں' میرا مکمل تعارف بھی تھا۔ اور میری شناخت بھی نام پہچان کا ایک ثبت ذریعہ سہی۔ لیکن اصل چیز تو انسان کی اپنی شناخت ہے۔ جب خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا

تو مجھے اپنی ذات مشکوک سی لگی۔ کیا میں اس مکان اور اس کے مکینوں کے لئے اجنبی ہو گیا ہوں یا پھر شاید میرے لہجے میں ہی اپنائیت کا فقدان ہو جس نے سب کو شبہ میں ڈال دیا ہو۔!

''اَبے او مرزا۔۔۔ دروازہ کھولتا ہے یا لاؤں کلہاڑی؟۔۔۔

میری فطری بشاشت لوٹ آئی۔۔۔ دروازے کے پیچھے جیسے زلزلہ آ گیا۔۔۔ آہٹیں سرگوشیاں۔۔۔ پھر سب کچھ معدوم ہو گیا۔

''خدا کے لئے دروازہ نہ کھولئے گا۔ وہ۔۔۔ وہ کلہاڑی لئے کھڑا ہے'' بھابھی کی منت بھری آواز پہچان کر مجھے ہنسی آ گئی مرزا نے دبنگ لہجے میں کہا۔۔۔

''۔۔۔اور جو اس نے سچ مچ دروازہ توڑ دیا تو۔۔۔؟''

صاف لگ رہا تھا کہ وہ گھر والوں کو مذاق میں ڈرا رہا ہے۔۔۔

''ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں ابا ۔۔۔ ایسا مزہ چکھائیں گے کہ۔۔۔۔۔۔''۔۔۔

مرزا کا بیٹا شاید نیا نیا جوان ہوا تھا۔ اس کی جوانی میں اُبال آ رہا تھا۔۔۔ جی تو چاہا کہ صاحبزادے کی سنہری ملائم مونچھیں اکھاڑ کر اسے پھر سے بچہ بنا دوں۔ نامراد ابھی کل تک میری گود میں گھس کر بیٹھتا تھا۔۔۔ اور میری سفید کلف لگی دھوتی کو منٹوں میں مِل دل کر رسوئی کی صافی بنا دیتا تھا۔۔۔ اور آج کیسا رستم زماں بن رہا ہے۔۔۔؟ مارے غصّے کے میرا خون کھول گیا۔ دُکھ اور شرمندگی سے میری آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔۔۔ لیکن اندر۔۔۔ بہت اندر دل کے کسی گوشے میں ایک ننھی سی چنگاری بھی دبکی ہوئی تھی۔ مرزا اور اس کے بچّوں کا پیار اس چنگاری میں مستور تھا۔۔۔ جسے شعلہ بننے کے لئے خلوص اور اعتبار کی ذرا سی ہوا کی ضرورت تھی۔۔۔ مجھے یقین تھا کہ دروازہ کھلتے ہی ہوا کا جھونکا آئے گا۔ اور چنگاری کو شعلہ بنا دے گا۔ میں نے نسبتاً نرم آواز میں کہا۔

''شاہد بیٹا! میں ہوں تمہارا ہرنام چاچا''۔۔۔

اپنا نام بتا کر میں اپنی نظروں میں خود ہی گر گیا۔ لیکن کیا کرتا مجبوری تھی۔۔۔ شاہد نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔

''ابّا گھر پر نہیں ہیں شہر سے باہر گئے ہیں''۔۔۔

'''' ارے ارے۔۔۔ یہ تو کیا بک رہا ہے کم بخت''

مرزا نے بلبلا کر بیٹے سے کہا۔۔۔

''آپ چُپ رہئے ابّا۔ آپ کو کچھ پتہ نہیں ہے''۔۔۔

جوان بیٹے نے بڑی حقارت سے بوڑھے باپ کو گھُڑ کا۔۔۔ آج وہ اپنے باپ کا باپ بن گیا تھا۔۔۔ اور میں ذلّت کی دَلدَل میں دھنستا چلا گیا۔۔۔ اب سُننے کے لئے باقی کیا بچا تھا۔۔۔ میں واپسی کے لئے مُڑ گیا۔ اچانک ایک دھماکے سے دروازہ کھُلا اور مرزا تیر کی طرح باہر آ گیا۔۔۔ اور میرا ہاتھ تھام کر لجاجت سے بولا۔

''رُک جاؤ ہرنام۔ تمہیں خدا کی قسم ہے رُک جاؤ''۔۔۔

مرزا کی گرِفت میرے بازو پر سخت ہو گئی۔ میں رُک تو گیا لیکن دل کا درد رو کے نہ رُکا۔۔۔

''کیا ابھی کچھ اور سُنوانا باقی ہے؟'' میں نے شکوہ کیا۔۔۔ مرزا شرمندہ اور اداس سر جھکائے کھڑا تھا۔۔۔ وہ بیٹے کی بدتمیزی پر شرمسار تھا۔ حالانکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔۔۔ قصور تو دراصل شاہد کا بھی نہیں تھا۔ حالات نے سب کو ایسی جگہ لا کر کھڑا کر دیا تھا کہ ایک دوسرے سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رہا تھا۔۔۔ کس کو الزام دیتے کس کو جُرم سے بری ہونے کا مثردہ سناتے۔۔۔ مرزا کے چہرے کی سُرخی دم بہ دم زردی میں بدلتی جا رہی تھی۔۔۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ اور میں نے اس کی پُشت پر ہاتھ پھیر کر دلاسہ دیا۔

''ہرنام! تم تو جانتے ہو کہ آج کل کے لڑکے اپنے آپے میں نہیں ہیں۔۔۔ بات کرو تو کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔۔۔ سب کی عقلوں پر پتھر پڑ گئے ہیں۔۔۔

میں تم سب کی خیریت پوچھنے آیا تھا''۔۔۔

''میں بھی تم لوگوں کے لئے فکر مند تھا۔ لیکن کیا کرتا فون کی لائنیں بھی کٹی پڑی ہیں۔ گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی کل تک جو گلیاں بانہیں پسارے ہمیں گلے سے لگانے کے لئے تیار تھیں اب ان سے گذرتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا ہے''۔۔۔

مرزا کا لہجہ زخم خوردہ تھا— میں تڑپ اٹھا۔ میرے دل میں بھی گہرے گہرے گھاؤ تھے— مرزا سے ملنے کے بعد یہ گھاؤ لہو اُگلنے لگے تھے— میں خود بھی ایک جان لیوا کرب سے گذر رہا تھا۔ ڈر تھا کہ یہ کرب چیخ بن کر ہونٹوں سے باہر نہ آجائے۔ اپنا دُکھ سینے میں چھپا کر رکھنا بھی بڑے حوصلے کا کام ہے۔ ہر پل یہی خوف رہتا ہے کہ کہیں گوشت کا ننھا سا لوتھڑا ہمارا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ اور دل کا سارا خون آنسو بن کر نہ بہہ جائے۔ سو میں نے ضبط سے کام لیا—

''ہرنام! ہمارا محلّہ نسبتاً محفوظ ہے تم سب کو لے کر یہیں آجاؤ''

مرزا نے بڑی محبت سے کہا—

''لو بھئی۔ تم تو ہماری برادری میں ہمارا حقہ پانی بند کرانے کا انتظام کر رہے ہو؟''—

میں ہنسا۔ نہ جانے کیسی ہنسی تھی۔ جس نے مرزا کو تڑپا دیا بظاہر بُرا مان کر بولا—

''اگر خدانہ کرے کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو برادری آپ کو کون سا تمغہ دے گی؟''—

''یہ تو میں نہیں جانتا— بلکہ تمغہ دینا اس کا کام بھی نہیں ہے۔ وہ تو بس لعنت ملامت کرنے کا فرض ادا کرتی ہے— پھر بھی رہنا تو اپنی برادری ہی کے بیچ ہے''—

''مذاق نہیں ہرنام۔ بس تم یہاں آجاؤ۔ جس طرح اب تک ہم نے دُکھ سُکھ مل کر بانٹے ہیں۔ اب بھی بانٹ لیں گے— اور جیسی پڑے گی ایک ساتھ بھگتیں گے''—

ایک بات کہوں مرزا— جس طرح تمہارے گھر میں ایک شاہد ہے اسی طرح ہر گھر میں ایک گرنام ہے۔ رہی دُکھ سُکھ بانٹنے کی بات۔ اب شاید عرصے تک ایسا نہ ہو سکے۔ وقت ہماری گرفت سے پھسل گیا ہے۔ یا پھر ہم ہی وقت کو قابو میں رکھنے کا گُر بھول گئے ہیں۔''—

''ہاں میں گُرنام کو تو پوچھنا بھول ہی گیا— وہ آنے والا تھا— اسے منع کردو۔ جب تک شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہوتے۔ وہ وہیں رہے۔ ہم اپنے بچّوں کو کسی درندے کے پاگل پن کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے— ہمارے بچّوں نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے''—

مرزا کی بات سن کر میرا دل بے قابو ہوگیا۔ جی چاہا چیخیں مار کر رونے لگوں—

کسی طرح خود کو سنبھال کر آہستہ سے کہا ''تمہارا مشورہ سرِ آنکھوں پر میرے بھائی۔ وہ تو یہاں کے حالات سنتے ہی بھاگا چلا آیا''۔۔۔

''نہیں۔۔۔'' ۔۔۔ چلا آیا۔۔۔؟ یہ کون سی حماقت تھی۔۔۔ اور تم بالکل سٹھیا گئے ہو۔۔۔ اسے منع کیوں نہیں کیا۔۔۔''

مرزا بالکل آپے سے باہر ہو گیا۔۔۔

''میں نے اسے بہت منع کیا تھا مرزا۔۔۔ لیکن اسے خود سے زیادہ ہماری فکر تھی۔۔۔ جانتے تو ہو۔۔۔ وہ ہمیں کتنا پیار کرتا ہے۔ مانو وہ ہماری اکلوتی اولاد نہ ہو۔۔۔ ہم اس کے اکلوتے ماں باپ ہوں''

''میں دل پر جبر کر کے مسکرایا۔۔۔''

''وہ سدا کا بھولا بھالا ہے۔ لڑائی بھڑائی سے تو دور بھاگتا ہے خیر اب آ ہی گیا ہے تو اس کا خیال رکھنا اور گھر سے باہر نہ نکلنے دینا۔ بُری گھڑی کبھی کہہ کر نہیں آتی''۔۔۔

''تم ٹھیک کہتے ہو'' میری آواز رُندھ گئی۔۔۔

''میں بھی کل پرسوں تک تمہاری طرف آؤں گا۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ گُرنام کو میرا پیار دینا۔ اور میری طرف سے بہت تاکید کر دینا کہ گھر میں رہے''۔۔۔

مرزا نے پھر یاد دلایا۔۔۔ اب میرے لئے وہاں ٹھہرنا دوبھر ہو رہا تھا۔۔۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔۔۔ میرا کلیجہ پھٹنے کے قریب تھا۔۔۔ بہت ضبط کیا لیکن دل پر قابو نہ رہا۔۔۔

الفاظ خود بخود ہونٹوں سے پھسلنے لگے۔۔۔

''مرزا۔۔۔ میرے بھائی! جانے سے پہلے مجھے اپنے بھتیجے گُرنام کا پُرسہ تو دے دو۔۔۔ اسٹیشن سے گھر آتے ہوئے بلوائیوں نے اسے مار ڈالا۔۔۔ میرا گُرنام مر گیا۔ میرا بیٹا مر گیا۔۔۔''۔۔۔

میں چیخ مار کر رو دیا۔۔۔

''گُرنام مر گیا؟۔۔۔ اس کی آواز میں بے یقینی اور دکھ تھا۔ اور مرزا نے میرا ہاتھ بھینچ

لیا— اس کی گرفت سخت ہوگئی۔ میرا پورا وجود کانپ اٹھا— اگلے پل مرزا کچی دیوار کی مانند ڈھے گیا— اور میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا—

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اسے گُرنام کے مرنے کی خبر کیوں دی— لیکن میں بھی کیا کرتا— صبر کا دامن میرے بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا—

نیا سال پہلے کی طرح اب بھی ہر برس آتا ہے— لوگ اپنے اپنے طریقے سے نئے سال کو خوش آمدید کہتے ہیں— میرا طریقہ سب سے جدا ہے۔ نئے سال کی آمد پر سب سے پہلے میں مرزا کی قبر پر حاضری دیتا ہوں— پھر گُرنام کی سمادھی پر جاتا ہوں۔ اور بھگوان سے ایک ہی دعا مانگتا ہوں—

''میرے معبود— تیری دنیا میں درندوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے— ایسا نہ ہو کہ ایک دن یہ دنیا محض درندوں کا جنگل بن جائے— ہمارے لئے نہ سہی— اپنے لئے سہی۔ انسان پیدا کر— وہ انسان جسے تو نے اشرف المخلوقات کہا ہے—



دو ہاتھ

پکّا جامنی رنگ — خدوخال میں کرختگی — ذرد ابھری ہوئی آنکھیں — اونچا قد و قامت، مضبوط ہاتھ پاؤں —— لیکن ہاتھوں کی اُنگلیاں ایسی گداز اور نرم — جیسے کسی فن کار کی ہوں۔فن کار تو وہ بھی تھیں — ان کی پور — پور میں جادوئی اثر تھا — ان کی ہتھیلیوں سے ٹھنڈی میٹھی لہریں سی بہتی تھیں۔ جیسے ہی وہ اپنے ہاتھ درد سے بے حال اور تڑپتی ہوئی عورت کے پیٹ پر رکھتیں — اسے قرار آ جاتا۔ ان کے ہاتھوں سے نکلنے والی ٹھنڈی، میٹھی لہریں برقی رَو کی طرح اس کے پورے بدن میں سرائیت کر جاتیں۔ پھر کہاں کا درد اور کیسی تکلیف؟ — ہاتھوں کے ساتھ ان کی زبان بھی پیار اور تسلّی کی پھوار برساتی تھی اور پھر ایک ننھا منا سا جیتا جاگتا وجود ان کے ہاتھوں میں آ جاتا۔ وہ بڑے فخر اور پیار سے اسے نہارتیں — ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگتی۔ وہ بچّے کو دو چار بار اُلٹ پلٹ کرتیں — اس کی پیٹھ پر ہولے ہولے تھپکیاں دیتیں — اور وہ ننّھی سی چیخ مار کر گویا اپنے ہونے کا اعلان کر دیتا — تب ان کے چہرے پر ڈھیروں سکون اتر آتا — اسے نہلا دھلا کر صاف کپڑے میں لپیٹ کر وہ اسے نانی، دادی یا خالہ کو تھما کر بڑے لاڈ سے کہتیں —

''لو سنبھالو اپنے شہزادے کو — بدماش (بدمعاش) نے میری بچّی کو ہلکان کر ڈالا — دیکھو تو کیسی بے سدھ پڑی ہے میری پھول سی لاڈو'' —

اس کے بعد وہ زچہ کی خبر گیری میں مصروف ہو جاتیں — دھان پان سی لڑکی۔ درد کا بحرِ بیکراں پار کرنے کے بعد — کنارے پہنچ جانے کے اطمینان اور لذت آگیں سُرور

میں سرشار ـــ غفلت کی نیند سوئی ہوتی ـــ اور انہیں ممتا کے نشے میں مست الست پڑی ہوئی لڑکی پر ٹوٹ کر پیار آ جاتا ـــ

دائی گیری عزیزن بوا کا خاندانی پیشہ نہیں تھا۔ ایک بار ـــ بڑی مجبوری میں انہوں نے کسی عورت کی مدد کی تھی ـــ پھر تو انہیں اس کام میں ایسی طمانیت اور خوشی ملی کہ وہ بس اس کی ہو کر رہ گئیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انھیں پیسے کا لالچ کبھی نہیں رہا ـــ جس نے جتنا دیا ہنسی خوشی لے لیا ـــ اگر کسی گھر کا چولہا ٹھنڈا دیکھا تو چپکے سے بچّے کی مٹھی میں دس پانچ کا نوٹ دبا کر دعائیں دیتی باہر نکل آئیں۔ کبھی کوئی پیچیدہ کیس ہوا تو فوراً گھر والوں کو اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا ـــ زندگی کی اہمیت کو ان سے زیادہ کون جانتا تھا ـــ؟

عزیزن بوا ـــ اپنے محلّے کے علاوہ آس پاس کے پانچ سات محلّوں میں مشہور تھیں۔ کوئی گھر ایسا نہیں تھا جہاں دو چار بچّے ان کے ہاتھوں دنیا میں نہ آئے ہوں۔ ان ہنستے کھیلتے بچّوں کو دیکھ کر ان کا دل پھول کی طرح کھِل جاتا تھا ـــ یوں تو زندگی دینا اور اس کی حفاظت کرنا اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ان کے دو ہاتھ جو ان ننّھی منّی جانوں کو دنیا میں لانے کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان کا احسان بھی کم نہیں تھا ـــ اپنے کام میں وہ بے حد مخلص تھیں ـــ ذات برادری کا فرق ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا ـــ خصوصاً غریبوں کا وہ بہت خیال رکھتی تھیں۔ پیسے والے تو مہنگے نرسنگ ہوم اور پرائیویٹ اسپتالوں میں کیس کرانے کی استطاعت رکھتے تھے ـــ لیکن اصل مصیبت تو بے چارے غریبوں کی تھی۔ سرکاری اسپتالوں میں ان کی جو درگت بنتی تھی۔ وہ کسی سے چھپی نہیں تھی ـــ ان کو تو بس خدا کے بعد عزیزن بوا کا ہی آسرا تھا ـــ اور وہ بھی انہیں مایوس نہیں کرتی تھیں ـــ

چند سال پہلے تک تو یہ حال تھا کہ ہر گھر میں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو چھ سات بچّے ہونا عام بات تھی۔ لیکن جب سے سرکار نے فیملی پلاننگ پر سختی سے عمل درآمد کرانے کی مہم شروع کی تھی ـــ لوگوں کو خود بھی عقل آ گئی تھی ـــ یوں بھی مہنگائی نے اچھے اچھوں کے حواس ٹھکانے لگا دیئے تھے ـــ اس دھندے میں ناجائز کمائی کے راستے بھی کم نہیں تھے ـــ لیکن عزیزن بوا ایسی کمائی پر لعنت بھیجتی تھیں۔ ان کے لئے تو حق حلال کے چار پیسے ہی بہت

تھے — پھر جو کام انسانی ہمدردی کے جذبے سے انجام پاتا ہے۔ اس کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اس خوشی کا بدل تو قارون کا خزانہ بھی نہیں ہو سکتا —

عزیزن بوا نماز روزے کی بہت پابند تھیں ان کی اٹیچی میں جہاں ضرورت کا ہر سامان رہتا تھا — وہیں دھلا ہوا ایک جوڑا — اور صابن بھی رکھا رہتا تھا — اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ فوراً غسل کرتیں اور دو رکعت نماز شکرانہ کی ادا کرتیں کہ ان کے ہاتھوں دو جانوں کی حفاظت کا فرض بخیر و بخوبی انجام پایا — ان کی زندگی کا خوبصورت ترین لمحہ بھی وہی ہوتا تھا — جب وہ ماں کے پہلو میں اس کے نونہال کو دیکھتی تھیں — ایک معصوم فرشتے کو اپنے قریب پا کر ماں کے چہرے پر جو سکون اور خوشی جھلکتی تھی — وہ ان کے لئے دو جہان کی دولت سے سوا تھی —

جو کام عبادت سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ اس کا صِلہ بھی انسان کو اس کی امید سے زیادہ ہی عطا ہوتا ہے — عزیزن بوا کو بھی ان کی عبادتوں کا صلہ مل گیا — اور حج کرنے کی ان کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی۔ محلّے والوں نے ہاتھوں ہاتھ سارے ضروری امور انجام دیئے۔ انہیں رخصت کرنے والوں کا ہجوم دیکھ کر ان کی ہر دلعزیزی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا گردن میں پڑے ہوئے ہار اور بازو میں بندھے ہوئے امام ضامن اس کا ثبوت تھے — سب کی خواہشوں اور آرزؤں کی امانت سنبھالے وہ ہنسی خوشی ان سے رخصت ہو رہی تھیں۔ کسی کو بیٹی کے لئے اچھا بر چاہئے تھا۔ کوئی روزگار میں ترقی کا خواہش مند تھا۔ کسی کو اولادِ نرینہ کی آرزو تھی — اور وہ فرداً فرداً سب سے دعا مانگنے کا وعدہ کر رہی تھیں — بھرے دل اور بھری آنکھوں کے ساتھ ہنسی خوشی وہ اس مبارک سفر پر روانہ ہوگئیں —

حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد جب وہ واپس آئیں تو چاہنے والے انہیں جلوس کی شکل میں گھر لے گئے اسٹیشن سے گھر تک پھولوں کی بارش اور نعرۂ تکبیر کی بازگشت نے عزیزن بوا کو نہال کر دیا — اور پھر دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا — ہر فرد کی خواہش تھی کہ وہ ان کی دعوت قبول کریں۔ بے چاری صبح و شام مرغن کھا کھا کر نڈھال ہوگئیں۔ خدا خدا کر کے یہ سلسلہ کم ہوا تو انھوں نے بھی چین کی سانس لی — نماز روزے کی تو وہ پہلے بھی بھی

پابند تھیں — اب ان کی عبادت میں اور اضافہ ہو گیا — ایک تبدیلی غیر شعوری طور پر ان کی زندگی میں اور آ گئی۔ اب وہ ہر کس و ناکس کا 'کیس' نہیں لیتی تھیں۔ ان کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا تھا کہ جن ہاتھوں سے اللہ کے گھر کو مس کیا ہے — اور مولائے کائنات کے روضۂ اقدس کی جالیوں کو تھام کر دعائیں مانگی تھیں۔ انہیں ہر ''اونچ نیچ'' کے کام میں نجس نہیں کریں گی۔ اوپر والے نے ابھی تک تو ان کی احتیاط کا بھرم رکھا تھا۔ لیکن اس پاک بے نیاز کی شان بھی نرالی ہے۔ جس کا اعتراف خود انہیں بھی تھا — ہر لمحہ ان کے لئے لمحۂ امتحان تھا —

اس رات سرِ شام بادل گھِر آئے تھے — جیسے جیسے رات گہری ہوتی گئی — ہلکی ہلکی پھوار نے بارش کا روپ دھارن کر لیا۔ سردی کا موسم اوپر سے غضب کی بارش — مانو برف گر رہی ہو — عزیزن بوا بھی جلدی ہی سونے لیٹ گئیں — موٹے سے لحاف کے ساتھ گرم کمبل اوڑھنے کے باوجود بھی ہاتھ پاؤں ٹھنڈے برف ہو رہے تھے — اور مارے سردی کے کلیجہ کانپا جا رہا تھا — انہیں بڑی دیر تک نیند نہیں آئی —

اچانک دروازہ کی کنڈی بجی تو انھوں نے سر سے لحاف کا کونہ سرکا کر اپنے بیٹے رمضانی کو دیکھا — وہ بھی سکڑا ہوا لیٹا تھا — خدا جانے سو رہا تھا۔ یا مٹ مارے پڑا تھا — کنڈی پھر بجی تو انھوں نے آواز دی —

''رمضانی — ذرا جا کر دیکھو کون ہے'' —

رمضانی منہ ہی منہ بڑبڑاتا ہوا — چھاتا لے کر باہر نکلا — اس نے دروازہ کھولے بغیر ڈپٹ کر پوچھا — ''کون ہے — ؟ اتنی بارش میں بھی قرار نہیں لینے دیتے — ؟'' ''ہم ہیں بھیا — کلوا — '' باہر سے جواب ملا — ''کیا بات ہے کلوا؟ — '' —

رمضانی نے دروازہ کھول کر نسبتاً نرم آواز میں پوچھا — ''بھیا — گھر والی بڑی تکلیپھ ما ہے — '' کلوا گھگھیا کر بولا اور بڑی آس سے رمضانی کی شکل دیکھنے لگا — بے چارہ پانی سے شرابور تھر تھر کانپ رہا تھا —

''اسے اسپتال لے جاؤ کلوا — ایسے موسم میں اماں نہیں جا سکتیں'' بارش کا رنگ دیکھ کر رمضانی نے بے مروتی سے کہا —

''بھیّا! ایسے ماسواری کہاں مل سکت ہے''۔۔۔

کلوا کی لاچاری اور بے بسی نے ایک پل کے لئے تو رمضانی کو بھی پسیجنے پر مجبور کر دیا۔۔۔ لیکن ماں کے خیال سے دل پر جبر کر کے بولا۔۔۔

''تب پھر صبح تک انتظار کرو۔۔۔ مجبوری ہے بھیّا''۔۔۔

کلوا نے ہاتھ جوڑ دیئے۔۔۔ اور گڑ گڑانے لگا۔۔۔

''بسیرے تلک تو گریب جندہ نہ بچے گی۔۔۔ او کی حالت بہوت کھراب ہے۔۔۔ تم جرا ماسی کو بتا دو''۔۔۔

کلوا کی بلبلاہٹ دیکھ کر رمضانی ماں کے پاس گیا اور سارا حال کہہ سنایا۔۔۔ عزیزن بوا کلوا کا نام سن کر چپ رہیں۔ پھر دھیرے سے بولیں۔۔۔

''اس بارش اور سردی میں بھلا کیسے جا سکتی ہوں؟''۔۔۔

''میں نے بھی کلوا سے یہی کہا تھا۔۔۔ لیکن۔۔۔''۔۔۔

''لیکن کیا۔۔۔؟''۔۔۔

''وہ غریب تو رو رو کر جان دے رہا ہے''۔۔۔

عزیزن بوا سوچ میں پڑ گئیں۔ بارش کا تو محض بہانہ تھا۔۔۔ اصل میں وہ جانا نہیں چاہتی تھیں۔ چند سال پہلے تک کلوا میلا اٹھاتا تھا۔۔۔ اب وہ سرکاری اسپتال میں نوکر ہو گیا تھا۔۔۔ لیکن کام تو اب بھی وہی تھا کم بخت سارے اسپتال کی گندگی صاف کرتا پھرتا تھا۔۔۔ کلوا کی گھر والی بھی محلّے کے ٹوائیلیٹ صاف کرتی تھی۔۔۔ فلیش کا سسٹم عام ہو گیا تھا۔۔۔ پھر بھی کام تو وہی تھا۔۔۔ بس ذرا صاف ستھرا ہو گیا تھا۔۔۔

ماں کی خاموشی دیکھ کر رمضانی نے کلوا سے انکار کر دیا۔ وہ دروازہ بند کر کے واپس آیا تو انہوں نے پوچھا۔۔۔ ''کلوا ہے یا چلا گیا۔۔۔''۔۔۔

''چلا ہی گیا ہوگا غریب۔۔۔'' کلوا نے لحاف میں گھستے ہوئے دھیرے سے کہا۔۔۔

عزیزن بوا نے بھی کروٹ بدل کر سر سے لحاف اوڑھ لیا۔۔۔ لیکن ان کی بے چینی بڑھتی گئی۔۔۔ بار بار کلوا کی گھر والی رُکمینا کا خیال آ رہا تھا۔۔۔ نامُراد بیاہ کر آئی تھی تو نو دس برس کی تھی۔۔۔ ساس اپنے ساتھ اسے سلام کرانے لائی تھی۔۔۔ اور انہوں نے اس کے مہندی لگے ہاتھ میں

پانچ روپے رکھ دیئے تھے — بیاہ کے بعد کئی سال تک اس کی گود خالی رہی — بڑی منتوں، مرادوں کے بعد ایک بچّی ہوئی بھی تو چار دن میں چٹ پٹ ہو گئی۔ ساس بھی پوتے کا منہ دیکھنے کا ارمان دل میں لئے ارتھی پر جا سوئی — اب رُکمینا کو پھر اوپر والے نے اولاد کا منہ دکھایا ہے — جو اصل خبر سے سب کام نمٹ جائے —"—

"رمضانی — کیا سو گئے؟"—

انہوں نے بیٹے کو آواز دی — رمضانی لحاف کے اندر منہ کئے ہوئے منمنایا—

"نئیں اماں اتنی جلدی نیند کہاں آتی ہے —؟"—

"ذرا میری اٹیچی اور ٹارچ لاؤ — ہاں چھاتا بھی لے لینا"—

عزیزن بوا نے جوانوں جیسی پھرتی سے پلنگ سے اٹھ کر گرم چادر لپیٹی — اور جانے کے لئے تیار ہو گئیں—

وہ کلوا کی کوٹھری میں داخل ہوئیں تو وہ انہیں دیکھ کر جی اٹھا — رُکمینا سچ مچ بہت تکلیف میں تھی — ان کے انکار نے تو اسے بالکل ہی مایوس کر دیا تھا — انہوں نے بڑے پیار سے اس کے بال سمیٹے — اور اپنے سفید جھاگ ایسے ڈوپٹے سے اس کا چہرہ پونچھ کر محبت سے کہا—

"میں واری جاؤں بیٹا — بس اب شانت ہو جا۔ اللہ کے حبیب کے صدقے میں انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا" فجر کے وقت اللہ ہُوا کبر کی آواز کے ساتھ ہی ایک ننھی سی چیخ نے اپنے 'ہونے' کا اعلان کیا — اور عزیزن بوا نے کالے کلوٹے گل گوتھنا سے بچّے کو ہاتھوں میں لے کر پیار سے ڈانٹا۔ "کیوں رے بدماش (بدمعاش) ساری رات ماں کو پریشان کر ڈالا — اب خود ٹیہوں ٹیہوں کر رہا ہے؟"—

رُکمینا نے عزیزن بوا کے دونوں ہاتھ اپنے کمزور ہاتھوں میں دبوچ کر چھاتی سے بھینچ لئے۔ آنسو بھل بھل اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے — لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی — مسکراہٹ تو عزیزن بوا کے ہونٹوں پر بھی رقص کر رہی تھی — ایک اَلو ہی مسکراہٹ — جس کا بدل اس دنیا میں تو ملنا ناممکن تھا — ہاں فرشتوں کا نہیں کہا جا سکتا — ممکن ہے یہ مسکراہٹ انہوں نے فرشتوں سے ہی مستعار لی ہو —

☆☆

چراغوں کا سفر

ایک طویل عرصہ تک ملک سے باہر رہنے کے بعد جب میں واپس آیا تو وطنِ عزیز کے سارے منظر اجنبی سے لگے۔ دیارِ غیر میں گھر اور وطن کی یاد ہر دم بے چین رکھتی تھی — اور ہر چھوٹی بڑی بات، واقعہ اور قصہ اہم محسوس ہوتا تھا — لیکن یہاں آکر پتہ چلا کہ وہ سب کتنا غیر اہم تھا یا یوں کہیں کہ بدلے ہوئے حالات نے ان کی اہمیت کم کر دی تھی۔

فلک بوس عمارتیں۔ کشادہ سڑکیں۔ جگمگ کرتے بازار، ہرے بھرے پارک، دھواں اگلتی فیکٹریاں، منٹ منٹ پر اڑان بھرنے والے ہوائی جہاز۔ اور تیز رفتار ٹرینیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ہمارا ملک بہت ترقّی کر چکا ہے۔ اپنی خوشی کو سینے میں دبائے میں ایک سرشاری کے عالم میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا — کہ اچانک ایک جانا پہچانا چہرہ میرے سامنے آ گیا — کسی ہمدم دیرینہ سے ملاقات کا ہونا کیسی مسرّتیں بخشتا ہے — یہ میں نے اس دم جانا۔ میں نے چاہا کہ لپک کر اسے اپنے سینے سے لگا لوں — لیکن وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا — اس کا رویّہ بالکل اجنبیوں جیسا تھا — سرد — اور جذبات سے عاری — وہ تو یاروں کا یار تھا — بے حد مخلص اور ٹوٹ کر چاہنے والا — اس کی تبدیلی کا اندازہ اس کی ہیئت سے بھی ہو رہا تھا — پہلے اس کے جسم پر صاف ستھرا کھدّر کا کرتا اور پاجامہ ہوتا تھا — اور دائیں کاندھے سے اس کا مخصوص جھولا لٹکتا رہتا تھا — جس میں اس کی ڈائیری اخباروں کے تراشے اور کسی فلاسفر کی کتاب ضرور رہتی تھی اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اور ہمارے گروپ میں اس کا جیسا قابل کوئی نہ تھا۔ ہم سب اس سے بہت مرعوب رہتے تھے — اس کے

خیالات نہ اتنے اونچے تھے کہ جہاں عام انسان کی رسائی نہ ہو — اور نہ ہی اتنے پست کہ اپنے آپ سے ندامت محسوس ہو۔ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا علمبردار تھا —

''کامریڈ! کیا حال ہے؟''

میں نے اس کی سرد مہری اور بے اعتنائی کو نظر انداز کر دیا —

''دیکھ لو — تمہارے سامنے موجود ہوں'' بالکل ٹھیک ٹھاک''

وہ دھیرے سے ہنسا — میں نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ مجھے کہیں سے 'ٹھیک' نہ لگا — میلا لباس، الجھے ہوئے گرد آلود بال۔ اور اس کے کاندھے سے ہر دم لٹکنے والا وہ جھولا بھی غائب تھا جس کے بغیر ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے — میں نے دلگرفتہ لہجے میں کہا —

''کامریڈ — تم کتنا بدل گئے ہو؟'' —

''میں بدل گیا ہوں یا زمانہ بدل گیا ہے؟'' — شکوہ کیا —

''زمانہ بدل گیا ہے تو کئی خوش گوار تبدیلیاں بھی اپنے ساتھ لایا ہے۔ لیکن تم تو ——'' —

''بس بس — آگے کچھ نہ کہنا'' —

اس نے مجھے ہاتھ اٹھا کر بولنے سے منع کیا —

''تم ڈالرز اور پونڈ کمانے کے چکّر میں پڑ کر 'وقت' کے بدلتے ہوئے رنگوں کی پہچان بھلا کیسے کر سکتے ہو — ؟ — ان دو آنکھوں نے زندگی کے اتنے رنگ دیکھے ہیں کہ رنگوں کی پہچان کرنا ناممکن ہو گیا ہے — سارے رنگ کھو گئے ہیں — پہلے ہمیں ہر چھوٹی سی بات، واقعہ یا حادثہ حیرت زدہ کر دیتا تھا اور ہم ہفتوں — بلکہ مہینوں اس کے اثر سے باہر نہیں نکل پاتے تھے — لیکن اب؟ — اب ایسا نہیں ہے دوست۔ یقین نہ ہو تو میرے ساتھ آؤ — میں تمہیں جو کچھ دکھاؤں گا اس کے بعد تم بھی حیرت کرنا چھوڑ دو گے'' —

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور تیزی سے ایک سمت بڑھ گیا — راستہ کچھ جانا پہچانا سا تھا — سڑک سے ہٹ کر برگد کا بوڑھا درخت اپنی لمبی لمبی جٹاؤں کا بوجھ سنبھالے اسی طرح

کھڑا تھا — وقت کے ساتھ وہ کچھ زیادہ ہی بوڑھا ہو گیا تھا — اس کے عقب میں ہمارا کالج تھا — جہاں ہم نے اپنی زندگی کے بہترین سال گزارے تھے — لیکن — اب وہاں کالج کی شاندار عمارت کی جگہ کھنڈر نظر آرہے تھے —

''کہو — کچھ یاد آیا؟'' — اس کا لہجہ درد میں ڈوبا تھا —

''— یہ — یہ ہمارا کالج ہے؟'' —

''ہاں — یہ جو جھلسی ہوئی دیواریں — اور شکستہ ستون نظر آرہے ہیں — کل تک یہ ہماری درسگاہ تھی۔ مادرِ علمی — جہاں ہمارے مہربان استاد برسوں کی ریاضت سے حاصل کیا ہوا علم قطرہ قطرہ کر کے ہمیں پلاتے تھے —— یہاں ملک کے بہترین دماغ بڑی کدو کاوش سے شاعر اد یب — دانشور اور سائنس داں — اور بہترین انسان تخلیق کرتے تھے — لیکن جب ہم علم کی گٹھری سنبھالے یہاں سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ وہ سارے سبق جو اس درسگاہ میں پڑھائے گئے تھے — عملی زندگی میں ان کی اب کوئی اہمیت نہیں ہے — بلکہ سرے سے ان کی ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ عالم و فاضل استاد کتنے نادان تھے — جنہوں نے ہمیں 'غلط' سبق پڑھائے — اب کم از کم نئی نسل ان ساری برائیوں سے پاک ہوگی جس نے ہمیں گمراہ کیا تھا — ہم اَمن، آشتی۔ انسانیت اور انسان دوستی کی باتیں سیکھتے رہے — اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم کسی کام کے نہ رہے — اور جن ہاتھوں میں اقتدار تھا — طاقت تھی — سب کچھ ان کے قبضے میں چلا گیا اور ہم خالی ہاتھ رہ گئے — اس سے کیا مطلب کہ وہ جاہل تھے — ہم علم و دانش کا جھنڈا بلند کرنے کی حسرت دل میں لئے رہے — وہ ہم سے بازی مار لے گئے — میں نے گردن جھکا کر اس کے ہر لفظ کا اعتراف کیا۔

''یہ لائبریری دیکھ رہے ہو؟۔ یہاں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں سجی رہتی تھیں — ہر زبان اور ہر موضوع پر لکھی گئی کتابیں اس کی شان تھیں — لوگ دور۔ دور سے اس لائبریری سے استفادہ کرنے آتے تھے۔ اور علم کی پیاس بجھاتے تھے۔ اب یہ خاک کا ڈھیر نظر آرہی ہے — لیکن افسوس کرنا تو درکنار رہا — کسی کو اس علمی زخیرے کی بربادی پر ندامت نہیں ہے — ہم نے یہاں بیٹھ کر 'ہرازم' کا مطالعہ کیا تھا۔ آخر میں راز کھلا کہ سب بکواس تھی۔ سب

ڈھکوسلہ تھا۔ انسان کو کسی 'ازم' کی نہیں دو وقت کی روٹی کی ضرورت ہے — یہ کتابیں کسی کا پیٹ نہیں بھر سکتیں — ان کے مطالعہ سے اچھا بھلا دماغ اُلٹ جاتا ہے — بڑے بڑے فلاسفروں کی تھیوریاں جب تک کتابوں کی زینت بنی رہیں۔ بہت خوبصورت لگیں — لیکن جب ان تھیوریوں کو زندگی میں برتنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ سب جھوٹ اور فریب کا پلندہ تھا — نری بکواس تھی — یہ راکھ کا ڈھیر اس بات کا ثبوت ہے کہ ان مفکّروں کے خوبصورت الفاظ اپنی دلکشی کھو چکے ہیں — دنیا کو اب ان کی ضرورت نہیں ہے — ان سے زیادہ ذہین تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے نیوکلیائی اسلحہ ایجاد کئے — جن سے پلک جھپکتے ساری دنیا کو تباہ کیا جاسکتا ہے — وہ ہنسا — بے تحاشا ہنسا — میں نے بددل ہو کر رخ موڑ لیا — اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ظاہر ہے کہ میں اس کی باتوں سے متفق نہیں تھا۔ ہمارے نظریات میں تضاد تھا اور دو مختلف خیالات کے لوگ ساتھ نہیں چل سکتے — ان کے راستے جُدا ہو جاتے ہیں۔

— وہ ایک بار پھر میری راہ میں حائل ہو گیا —

"بس چند قدم اور میرے ساتھ چلو۔ پھر تم اپنی راہ چلے جانا — اور میں؟ — میں کہاں جا سکتا ہوں۔ مجھے تو یہیں رہنا ہے۔ اور وہ سب کچھ دیکھنا ہے۔ جو نام نہاد ترقی کے ..م پر ہمیں دکھایا جا رہا ہے" —

میں اس کے ساتھ چلنے پر خود کو مجبور پا رہا تھا — پھر ہم ملبے کے ایک ڈھیر کے سامنے رک گئے —

"یہ کیا ہے کامریڈ؟" —

میں نے خوفزدہ ہو کر سوال کیا۔ مجھے اس کے جواب کی سفّاکی کا اندازہ تھا — پھر بھی سوال کرنے پر مجبور تھا —

"کل تک یہاں ایک فلک بوس عمارت تھی۔ آج یہ ملبہ ہماری اخلاقی پستی پر ماتم کر رہا ہے — اس چودہ منزلہ عمارت کی ہر منزل پر زندگی کو بھرپور طریقے سے جینے والے لوگ روزانہ کی طرح کاروبارِ حیات میں مصروف تھے — ملک کی معیشت کا سارا دارومدار اس

عمارت میں کام کرنے والوں کے کاندھوں پر تھا— لیکن ریموٹ کنٹرول کی ایک جنبش نے پلک جھپکنے میں سب کچھ ختم کر دیا— جو لوگ بارود کے اس ڈھیر میں زندہ دفن ہو گئے — گویا اپنی موت سے پہلے ہی مر گئے— چند ہفتوں میں یہ ملبہ صاف ہو جائے گا— لیکن جانے والے اب کبھی واپس نہیں آئیں گے —''—

میں سِسک اٹھا— اور وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا—

''یہ ریاکاری کس لئے میرے دوست؟— ''یہ منافقت کیوں—؟ جب یہ سب زندہ تھے— تو ہم نے ان سے بیر باندھا— اور جب مر گئے تو ہم ان پر آنسو بہار ہے ہیں''— اور معاف کرنا یار— اب تو ان آنسوؤں کا مزہ تک بدل گیا ہے— کبھی ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور غم ان آنسوؤں سے عبارت تھے— بپھرے ہوئے سمندر کے کھارے پانیوں جیسے نمکین آنسو اس وقت لہو رنگ نہیں تھے— وہ آنسو بس آنسو تھے— صاف، شفاف اور بے ریا— اب جو آنسو ہماری آنکھوں سے نکلتے ہیں— تو زبان کو خون کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے— لہو رونے سے تو اچھا ہے کہ ہماری آنکھیں خشک رہیں۔ بلا سے ہمیں کوئی سنگدل کہے یا ظالم!''—

ایک ٹھنڈی سانس میرا سینہ چیر کر باہر آ گئی—

''تم بہت دکھی نظر آ رہے ہو؟''—

اس نے ہمدردی سے کہا— اور میرا جی چاہا کہ اس سے لپٹ کر رونے لگوں—

''ان خونیں مناظر سے پرے ایک جگہ ایسی بھی ہے جہاں بیٹھ کر سکون ملتا ہے— اُس دھرتی کے ذرّہ ذرّہ میں خدا اور بھگوان بستے ہیں— قدم قدم پر وہاں سجدوں کے نشان ملتے ہیں— ایسی مقدّس جگہ زمین کے جس خطّے پر ہوگی۔ سورگ کہلائے گی۔ رام اور رحیم کی یہ بستی بھی ایسی ہی پوتر اور مقدس ہے— وہاں ہمیں اپنے کان اور آنکھیں بند کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اُن نظاروں کو اپنی آتما میں بسانے کو جی چاہتا ہے— ہماری سماعت میں اذان اور ناقوس کی آوازیں الوہی گیت بن کر شہد ٹپکاتی ہیں۔ وہیں ہماری نجات ہے— ہم بھی تو نجات کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ آؤ ہم اپنا سر جھکائیں— اور اپنے رب سے امن

اور شانتی کی دعا کریں ۔۔۔ ‘‘

اس نے محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا ۔۔۔

’’ آؤ دوست آگے بڑھیں ۔۔۔ اور اپنی منزل تلاش کریں ‘‘ ۔۔۔

ہماری منزل کہاں ہے؟ ۔ میں نے بے یقینی سے پوچھا ۔۔۔

’’ ذرا میرے ہاتھوں پر نظر ڈالو ‘‘ ۔۔۔

میں نے دیکھا اس کے ہاتھوں میں دو مشعلیں روشن تھیں ۔۔۔

’’ یہ امن کی روشنی ہے ۔۔۔ اور ہم اس روشنی کے سہارے اپنی منزل کی تلاش جاری رکھیں گے ‘‘ ۔۔۔

اس نے ایک مشعل میرے ہاتھ میں تھما دی ۔۔۔ روشنی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی ۔۔۔ نقطہ دائرہ بنا ۔۔۔ پھر یہ دائرہ بڑھتا گیا ۔۔۔ مغرب سے مشرق تک ۔ شمال سے جنوب تک اور پھر زمین سے آسمان تک روشنی پھیل گئی ۔۔۔

۔۔۔ کامریڈ کا ہیولہ دور ہوتا جا رہا تھا ۔۔۔ امن کی مشعل بدستور روشن تھی ۔۔۔ بس اسے تھامنے والے ہاتھ بدل گئے تھے ۔۔۔ چراغوں کا سفر جاری تھی ۔۔۔ اور میرے ہونٹ مسکرا رہے تھے ۔۔۔

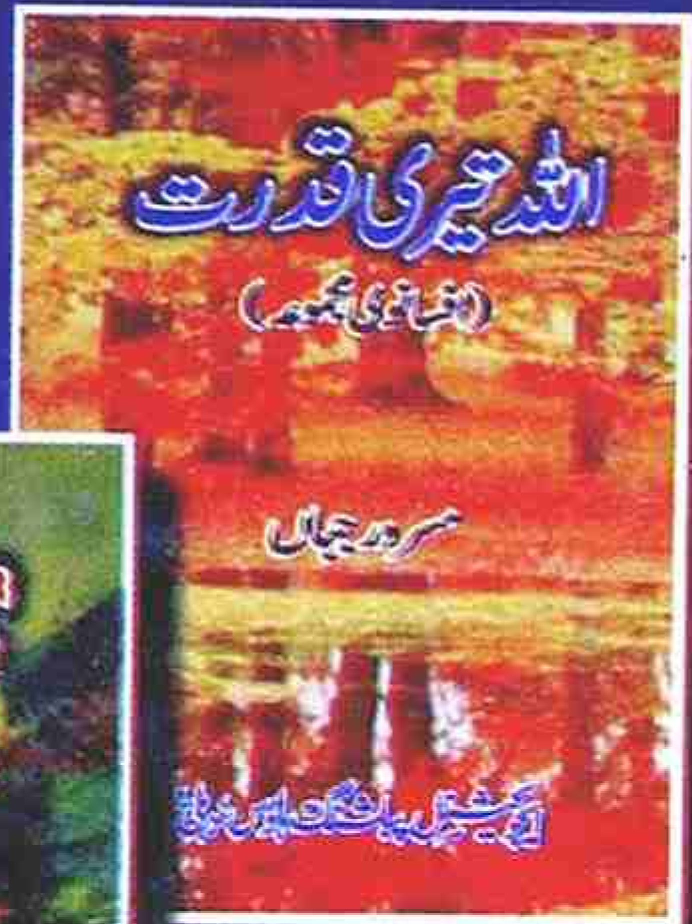


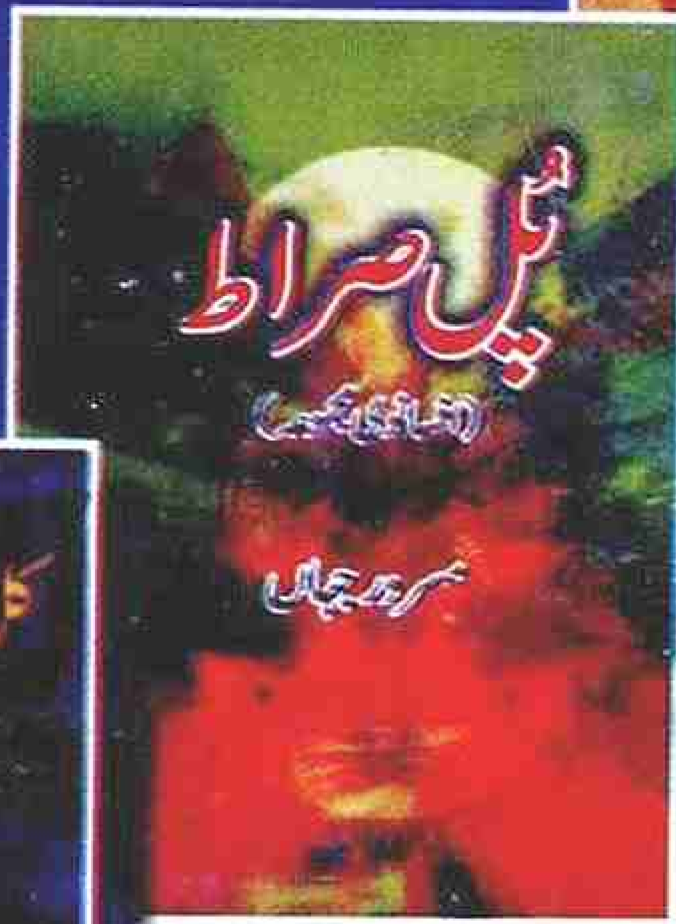
KAHAN HO TUM

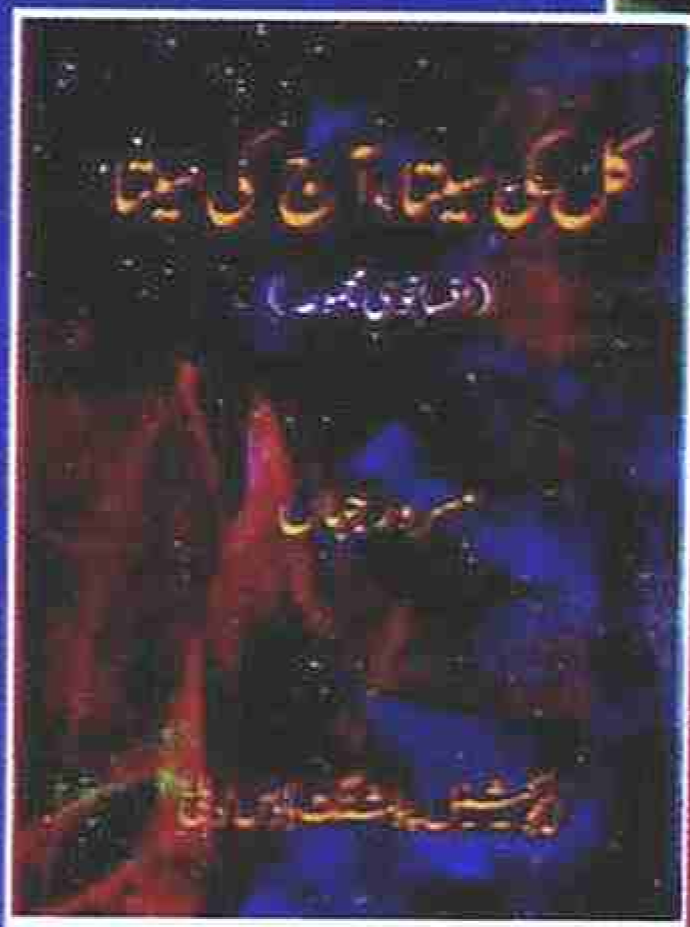
(Short Stories)

by

Masroor Jahan







EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

